داستانِ زبانِ اردو

ڈاکٹر شوکت سبزواری

انجمن ترقّی اُردو پاکستان
بابائے اُردو روڈ کراچی ۱

67
تاریخ علوم و فنون
۲۰۵

داستانِ زبانِ اردو

56452
148|067
6476

ڈاکٹر شوکت سبزواری

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان نمبر ۴۵۸

تعداد ..... ایک ہزار
بار دوم ..... مارچ ۱۹۸۷ء
طابع ..... انجمن پریس۔ کراچی
قیمت ..... پچیس روپے

انجمن پریس میں کلیم الحسن نقوی کے اہتمام سے طبع ہوئی

یہ کتاب ... پروفیسر رشید احمد صدیقی کی
یاد میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کو
ہدیتاً پیش کی جا رہی ہے

56452
148/067
0006476

فہرست مطالب

پیش لفظ ۳

(۱) اُردو ۵

(۲) لسانی سرمایہ ۲۰

(۳) مختلف نظریے ۳۷

(۴) اردو اور پنجابی ۶۶

(۵) مولد و منشا ۹۰

(۶) اخذ و استفادہ ۱۱۴

(۷) صرفی نحوی نشو و نما ۱۳۶

(۸) مزاج و منہاج ۱۶۲

(۹) ارتقائی مراحل ۱۷۷

(۱۰) اردوئے قدیم ۲۰۰

پیش لفظ

میرا تحقیقی مقالہ "اُردو زبان کا ارتقا" ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں اردو زبان کا نشوونما دکھایا گیا تھا اور اس کے صرفی، نحوی، صوتی سرمایے کا تاریخی جائزہ لینے کے بعد اس کے آغاز اور ماخذ کے متعلق کچھ مختصر سے اشارے کئے گئے تھے۔ "داستان زبان اُردو" ان مختصر اشارات کی ترجمان ہے۔

اُردو میں اُردو زبان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود اُردو کا ارتقا، نشوونما، مزاج و منہاج، فطرت، سرشت ابھی تاریکی میں ہے۔ اُردو آریائی خاندان کے کس گھرانے سے ہے برصغیر پاک و ہند کی جدید آریائی نسل کی زبانوں اور بولیوں سے اس کا کیا رشتہ ہے، اس کے موجودہ خط و خال کب اور کہاں اُبھرے، ان زبانوں سے اس نے کسب فیض کیا کن منازل سے گزر کر وہ ارتقا کے اس درجے تک پہنچی؟ ان سوالات کا اردو کے ماخذ اور اس کے آغاز یا ارتقا سے بہت گہرا تعلق ہے۔ جب تک یہ سوالات حل نہ ہوں اس کا ماخذ طے نہیں ہو سکتا اور اس کے آغاز کے بارے میں صحیح تعصب سے پاک اور علمی بنیادوں پر استوار رائے نہیں دی جا سکتی۔ اپنے بزرگوں اور دوستوں کی صلاحیتوں اور اپنی کوتاہیوں کے اعتراف کے باوجود مجھے اس کا افسوس ہے کہ اردو کے آغاز کے بارے میں لکھنے والے عام طور سے مذکورہ بالا سوالات سلجھائے بغیر اس کے آغاز اور ماخذ کی بابت اپنے فیصلے ـــ اور وہ بھی اٹل فیصلے ـــ صادر کرتے رہے ہیں۔

چنانچہ میں نے ضروری سمجھا کہ اصل اردو کا تاریخی ارتقا دکھاؤں اس کے بعد اس کے آغاز کو بحث میں لاؤں ـــ "داستان" کا موضوع خاص طور سے اردو کا آغاز ہے۔ اس میں شرح و بسط کے ساتھ اس پر بحث کی گئی ہے اور ان تمام سوالات کے جواب دیئے گئے ہیں جو اُردو کے آغاز سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کی فطرت و سرشت سمجھنے میں معاون ہیں۔ جو اصحاب مجھ سے زیادہ جانتے ہیں بہت ممکن ہے وہ ان سوالات کا بہتر طور سے اطمینان بخش حل پیش کر سکیں۔ یہ ایک

کوشش ہے اور مخلصانہ کوشش ہے۔ اہل علم کوشش سمجھ کر ہی اس پر نظر کریں اور اس کے خلوص کی — اگر اس میں خلوص ہو — قدر کریں۔

اردو کے آغاز اور ماخذ کے بارے میں آج تک جو نظریے پیش کئے گئے ہیں — سنجیدہ اور غیر سنجیدہ دونوں قسم کے — ان پر میں نے کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے اور ناقدانہ نظر ڈالی ہے — اپنی طرف سے میں نے کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر اختر اورینوی اور پروفیسر احتشام حسین فرماتے ہیں کہ میں پالی کو اردو زبان کی اصل قرار دیتا ہوں یہ درست نہیں۔ میں وہی کہتا ہوں جو جولس بلاک، گریرسن، چٹرجی اور دوسرے آئمۂ فن نے کہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اردو جس زبان سے ارتقا پائی ہے وہ کبھی بالائی دوآبے میں بولی جاتی تھی۔ سنسکرت، پالی، شورسینی پراکرت، مغربی اپ بھرنش، بالائی دوآبے کی اس بول چال کی زبان کے مختلف ادبی روپ ہیں۔ کھڑی، یا ہندوستانی (اردو) اس کی فطری ترقی یافتہ (یا بدلی ہوئی) صورت ہے۔ یہ زبانیں اردو کے راست سلسلۂ نسب میں نہیں آتیں۔ میں نے "داستان" میں اس بول چال کی قدیم پراکرت اور اپ بھرنش کی تشخیص و تعیین کی کوشش بھی کی ہے اس لئے عام اہل علم کی روش سے ہٹ کر اور تاریخی ترتیب بدل کر میں نے اردو کی خصوصیات میں اور ان کی نشان دہی کرتا اور قدیم سے قدیم تر زبانوں میں۔ ان کا کھوج لگاتا اور سلسلہ ملاتا گیا ہوں۔ یہ انداز بحث نیا ہے۔ شواہد، دلائل، اور امثلہ میں بھی طبیعی منہج سے کام لیا گیا ہے۔ نتائج وہی ہیں جنہیں ماہرین فن اس سے پہلے وضاحت کے ساتھ پیش کر چکے ہیں۔

یہ مقالہ اردو کی ایک خصوصی اشاعت میں چھپا تھا۔ نظر ثانی کرکے اور دو نئے باب اضافہ کرنے کے بعد اب اسے کتابی شکل میں طبع کرایا جارہا ہے۔ میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اسے اس قابل سمجھا کہ رسالہ "اردو" کی ایک اشاعت اس کے لئے مخصوص کردی گئی۔ ان کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ یہ مقالہ بالکل نئی شکل میں انجمن ترقی اردو سے شائع ہو رہا ہے۔ قارئین کو اس میں کتابت کی کچھ فروگزاشتیں نظر آئیں گی۔ مجھے امید ہے ان فروگزاشتوں کا ذمہ دار وہ مجھے اور مولوی صاحب قبلہ کو نہ ٹھہرائیں گے۔

(شوکت سبزواری)

۱۴ جولائی ۱۹۶۰ء

(۱)

"اُردو"

اُردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں شاہی لشکر یا معسکر یعنی چھاؤنی۔ اردو کو اوّل اوّل زبان اُردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد کہا گیا۔ کثرتِ استعمال کے زبان کا لفظ گرا تو اردوئے معلیٰ یا اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد رہا۔ اس کے بعد صرف اُردو۔ تنہا اردو کے زبان کے معنی میں ڈاکٹر بیلی کو مصحفی (۱۸۲۴ء — ۱۷۵۰ء) کے یہاں ملا۔

خدا رکھے زباں ہم نے سُنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس مُنہ سے ہم اے مصحفی اُردو ہماری ہے

ڈاکٹر بیلی کا قیاس ہے کہ یہ شعر ۱۷۷۶ء کے قریب کہا گیا۔[1] میر تقی میر نے نکات الشعراء (۱۷۵۲ء) میں اردو کو زبان اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد دہلی کے نام سے یاد کیا ہے۔[2]

"پوشیدہ نماند کہ در فنِ ریختہ کہ شعرے ست بطورِ شعر فارسی بہ زبان اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد دہلی کتابے تاحال تصنیف نہ شدہ"

ذکر میر میں ہے:۔

بعد از چندے با سعادت علی نام سیدے کہ از امروہہ بود بر خوردم۔ آں عزیز مرا

---

[1] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء صفحہ ۲۹۳
[2] صفحہ ۱

تکلیف موزوں کردن ریختہ کہ شعر بیت بطور شعر فارسی بہ زبان اردوئے معلیٰ بادشاہ ہندوستان کردہ آں وقت رواج داشت کرد"

ڈاکٹر بیلی کہتے ہیں[1]: "ہو سکتا ہے اردوئے معلیٰ سے میری مراد فصیح اور مستند اردو زبان ہو میرے خیال میں قلعۂ معلیٰ کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی۔ اگر میری مراد شستہ اور رفتہ زبان ہوتی تو وہ زبانِ قلعۂ معلیٰ کہتے۔

مخزنِ نکات (۱۷۵۵ء) میں قائم فرماتے ہیں[2]:-

"اکثرے از ترکیبات فرس کہ موافق محاورہ اُردوئے معلیٰ از بس گوش می یابند من بسنہ جواز البیان می دانند"

میر کے موزوں طبع صاحب زادے عرش کا ارشاد ہے:-

ہم ہیں اُردوئے معلیٰ کے زباں داں اے عرش
مستند ہے جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں

شیخ سعد اللہ گلشن نے بقول قدرت ولی کو مشورہ دیا تھا[3]:-

"زبان دکھنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد موزوں بکنید"

ڈاکٹر بیلی نے تذکرہ گلزار ابراہیم (۱۷۸۳ء) اور تذکرۂ ہندی مصحفی (۱۷۹۴ء) سے ذیل کی عبارتیں نقل کی ہیں۔ ان میں زبانِ اردو استعمال ہوا ہے:-

"تتبع زبانِ اُردو نمودہ" (گلزار ابراہیم زیر ترجمہ وصالت خاں ثابت)

"ادائے زبان اُردو" (تذکرہ ہندی زیر ترجمہ محمد امان ناثر

میر امّن باغ و بہار (۱۸۰۱ء) ٹھیٹ اردو میں لکھتے ہیں۔ انہوں نے زبان اُردو کا ترجمہ "اردو کی زبان" فرماتے ہیں[4]:-

---

[1] جرنل ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۹۴
[2] صفحہ ۳۲
[3] بحوالہ پنجاب میں اردو صفحہ ۱۸۔
[4] باغ و بہار مقدمہ

"حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے"

انشاء اللہ خاں انشا دریائے لطافت (۱۸۰۷ء) میں فرماتے ہیں[1]:-

"خوش بیانان آنجا متفق شدہ از زبانہائے متعدد الفاظ دلچسپ جدا نمودہ و در بعضے عبارات بکار بردہ زبان تازہ سوائے زبانہائے دیگر بہم رسانیدند و بہ اُردو موسوم ساختند"

حکیم احمد علی یکتا صاحبِ دستور الفصاحت لکھتے ہیں[2]:-

"اُردو عبارتست از زبانے کہ بعد اختلاط و ارتباط الفاظ پنجابی و میواتی و برج ... باکلمات فارسی و عربی و دیگر زبانہا پیدا شدہ"

سترھویں صدی عیسوی میں عام طور سے اُردو کو اُردو کے نام سے پکارا جاتا تھا اور ہر زبان پر اس کا چرچا تھا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ فرماتے ہیں[3]:-

"مخلوط اور رسمی بولی اُردو یعنی دربار کی مہذب اور شائستہ زبان جو آج بھی اس حکومت کے وسیع پہنا اور صوبوں میں رائج کرتی ہے کہ کبھی ہندوستان کی قدیم ترین سلطنت شمار ہوتی تھی"

یہ عبارت ۱۷۹۸ء میں لکھی گئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردو ہماری زبان کا قدیم نام ہے جو شاہی فرودگاہ اور دربار سے تعلق کی بنا پر خود اہل ملک نے اُردو کو دیا اور جو اس وقت سے لے کر آج تک برابر استعمال ہو رہا ہے۔ ہند و اہل علم نے اسے "کھڑی بولی" کے نام سے یاد کیا اور اس کے مقابلے میں برج کو، جو اس وقت تک ہندی شاعری کی جان اور اس کی زبان سمجھی جاتی تھی، "پڑی" کہہ کر پکارا۔ للو جی لال اور سدل مصر ۱۸۰۳ء کے لگ بھگ کھڑی بولی کا نام لیتے ہیں۔ للو لال لکھتے ہیں[4]:-

---

[1] صفحہ ۲
[2] دستور الفصاحت صفحہ ۴ (مقدمہ)
[3] ہندوستانی زبان کی گرامر
[4] مقدمہ پریم ساگر۔

"عربی و فارسی الفاظ کو چھوڑ کر میں نے یہ کہانی دلی آگرے کی کھڑی بولی میں لکھی ہے"

سدل مصر کہتے ہیں[۲]:-

"کچھ لوگ ناسکیتو اپاکھیان کو سنسکرت میں ہونے کے باعث سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس لئے کھڑی بولی میں میں نے اس کا ترجمہ کیا۔"

ڈاکٹر گلکرسٹ کھڑی بولی کے معنی ٹھیٹ ہندوستانی بتاتے ہیں[۳]:-

"ان میں بہت سی کہانیاں کھڑی بولی یا ہندوستانی کے خالص ہندوانہ اسلوب میں بیان کی گئی ہیں۔ کچھ برج بولی میں ہیں۔"

شیام سندر داس کی حسب ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو اہل قلم نے اردو کے قدیم روپ کو برج اور اودھی سے امتیاز کے لئے کھڑی کے نام سے یاد کیا[۴]:-

"۱۳۵۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان قدیم ہندی بولیوں نے دھیرے دھیرے برج اودھی اور کھڑی بولی کا روپ دھارا۔"

راما شنکر پرشاد لکھتے ہیں[۵]:-

"سدل مصر اور للو لال نے برج بھاشا سے دلی کی کھڑی بولی میں قصے لکھے۔"

رام چندر شکل کھڑی بولی کی بابت فرماتے ہیں[۶]:-

"ان دنوں اور اس سے پہلے کھڑی بولی تعلیم یافتہ ہندوؤں کی مہذب زبان تھی جو دہلی سے پہاڑ تک کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔"

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی رائے اس بارے میں سب سے الگ ہے ان کے نزدیک[۷]

"کھڑی بولی کے معنی گنواری بولی ہے جسے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شاخ۔"

---

۱ مقدمہ ناسکیتو پاکھیاں
۲ دی ہندی اسٹوری ٹیلر ج ۲ صفحہ ۴
۳ ہندی بھاشا کا وکاس صفحہ ۵۲
۴ ہندی ساہتیہ کا سنکشپت اتہاس صفحہ ۱۲۰
۵ ہندی بھاشا اور ساہتیہ صفحہ ۳۱۰
۶ اردو جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۵۹۰

کھڑی کے دو معنی ہیں۔ اکھڑ اور کھردری۔ اُردو کو کھڑی اس لئے کہا گیا کہ برج کے میٹھے اور رسیلی بولیوں کے مقابلے میں اُردو کا لہجہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ مسلمانوں نے جب تک کھڑی کو منہ نہ لگایا ہندو برج اور اودھی ہی میں شاعری کرتے رہے۔ کھڑی کے دوسرے معنی ہیں وہ بولی جس کے اسماء و افعال کے آخر میں "ا" ہو۔ اُردو کھڑی ہے اس لئے کہ اس کے اسماء و صفات "ا" پر ختم ہوتے ہیں۔ برج، قنوجی، بندیلی اور اودھی پڑی ہیں۔ ان کے صفات و افعال کے آخر میں و یا ے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بیلی کہتے ہیں[۲] کہ بندیل کھنڈ میں کھڑی بولی ٹھاڑ بولی کہلاتی ہے اور مارواڑ میں ٹھاٹ بولی کھڑی بولی رائج الوقت یا چالو ہندوستانی زبان ہے۔ "یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ اُردو کی قدیم شکل یعنی ہندوستانی کے سوا کھڑی کا اطلاق کبھی کسی اور زبان پر نہیں ہوا۔"

ہندوستانی کو ایک طرف برج سے امتیاز کے لئے کھڑی کہا گیا۔ برج اس زمانے میں بھاکا کہلاتی تھی۔ بھاکا یا بھاشا کے معنی ہیں زبان۔ ہر زبان بھاکا ہے لیکن جب یہ لفظ تنہا استعمال ہوا تو اس سے برج کی زبان مراد ہوئی۔ میرزا خاں فرماتے ہیں[۳]:-

"اطلاقِ آں سوائے سنسکرت و پراکرت عموماً شامل جمیع زبانہاست وخصوصاً زبان اہلِ برج بود۔"

شاہ حاتم فرماتے ہیں[۴]:-

"زبان ہر دیار تا بہندوی کہ آں را بھاکا گویند موقوف نمودہ۔"

انشاء اللہ خاں انشا رانی کیتکی کی کہانی کی ابتدائی سطروں میں لکھتے ہیں[۵]:-

"کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے"

اس کے بعد اس کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ "ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا

---

[۱] زبان اہلِ برج افصح زبانہاست۔ و بر زبان اہلِ نظم و صاحب طبع اکثر جاریست (تحفۃ الہند صفحہ ۴۴)

[۲] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۸ صفحہ ۳۶۴

[۳] تحفۃ الہند صفحہ ۴۵

[۴] دیوان زادہ مقدمہ۔

[۵] رانی کیتکی کہانی مقدمہ

بن بھی نہ ٹھنس جائے۔ جیسے پہلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں جیوں کا تیوں وہی ڈول رہے اور چھانہ کسی کی نہ پڑے۔"

"بھاکا پن" سے انشا کی مراد برج بھاشا کی پٹ ہے۔

اردو سے جو اس زمانے میں ہر شخص کی زبان پر تھا ہندوؤں کو بیر تھا۔ اُردو مسلمان کی زبان سمجھی جاتی تھی اس میں عربی و فارسی الفاظ کی کثرت تھی یہ الفاظ دہلی کی زبان یعنی پرانے قدیم یا کھری بولی میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے رائج نہ تھے۔ فارسی زبان کے اثر سے بعد میں شامل ہوئے۔ ہندوؤں نے فارسی و عربی کے اس سرمایہ کو غیر ملکی قرار دے کر نکال باہر کیا اور ہندوؤں کے لئے بول چال کی کھری زبان بنائی جس کا نام اوّل اوّل کھری (خالص) تھا جو بگڑ کر کھڑی بنا۔ کھڑا جیسے فرخ آبادی کا "کھرا" بھی کھرا ہی کا بگاڑ ہے اس قیاس کی تائید گلگرسٹ کے مندرجہ ذیل اقوال سے ہوتی ہے:-

(۱) اصلی کھری بولی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی بنیاد ہندوستانی گرامر پر ہے لیکن اس میں سے عربی و فارسی الفاظ خارج کر دیئے گئے ہیں۔"

(۲) کھڑی یا ہندوستان کی خالص اور نکھری ہوئی زبان میں شکنتلا کا یہ دوسرا ترجمہ ہے۔ کھڑی بولی ہندوستانی ہے صرف اس امر میں مختلف ہے کہ اس میں سے عربی و فارسی الفاظ نکال دیئے گئے ہیں۔"

ان سے دو باتیں معلوم ہوئیں اوّل یہ کہ کھری اُردو کی وہ شکل ہے جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے دہلی میں رائج تھی۔ دوسرے "کھڑی" اُردو کا قدیم نام نہیں۔ یہ نام اس کو بعد میں اس وقت دیا گیا جب عربی و فارسی الفاظ نکال کر اسے شدھ (خالص) یا کھرا بنا لیا گیا۔ عربی یا فارسی الفاظ کی جگہ ٹھیٹ سنسکرت الفاظ نے لی تو اس کا نام ہندی (جدید ہندی یا ہندوستان ہندی) ہوا جو پوری طرح اردو کے مقابلے کی زبان بنی۔ ہندوستانی ہندو اور

لہ بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز صفحہ ۳۶۷ -

5645
148/076
0006476

مسلمان دونوں قوموں کی مشترک بول چال کی زبان تھی جس میں فارسی عربی الفاظ سنسکرت کے تدبھو لفظوں کے پہلو بہ پہلو بولے جاتے تھے۔ اردو اس زبان کا ادبی روپ ہے۔

ہندوؤں نے ۱۸۰۰ء کے قریب اول اول بول چال کی زبان ہندوستانی سے مسلمانی الفاظ نکال کر خالص ہندووانی بول چال کی زبان کا ڈول ڈالا اور اسے کھڑی (یا کھری) کہنا شروع کیا۔ بعد میں خالص سنسکرت (تت سم) الفاظ سے اس کا دامن بھر کر موجودہ ہندی بنائی جو اردو کے مقابلے کی ہندوانہ تہذیبی ادبی زبان کہلاتی۔ کھڑی اور ہندی دونوں میں ہندوانہ ذہنیت و عصبیت کارفرما ہے۔ دونوں پر خود ساختگی کی چھاپ ہے اس لئے ہندوستانی (اردو) کا نام کھڑی مبصروں تک محدود رہا اور مولوی عبدالحق کو یہ کہنا پڑا کہ وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شاخ ہندوؤں میں بھی بقول ڈاکٹر بیلی یہ نام فروغ نہ پا سکا اور سدل مصر و للولال کے بعد ۱۸۶۷ء تک کسی ہندو عالم نے اردو کے اس نام کا ذکر نہیں کیا۔ راجا شیو پرشاد لکھتے ہیں۔[1]

"یہ پراکرت عربی و فارسی لفظوں کے سرمایے سے مالا مال ہے۔ اسے ہندی کہیں یا ہندوستانی یا بھاکا یا برج بھاکا یا ریختہ یا کھڑی لبلی یا اردو یا اردوئے معلیٰ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا تخم محمود غزنوی کے پیروں نے ڈالا۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:-

"جب ڈاکٹر گلکرسٹ نے میر امن اور للو لال کوی سے نثر میں کتابیں لکھنے کو کہا تو وہ پریشان ہوئے یہ ان کے لئے نیا تجربہ تھا۔ انھوں نے لکھا تو لیکن ایک خود ساختہ زبان میں۔۔ للو نے اپنی کتاب پریم ساگر میں فارسی و عربی زبان کے اجنبی لفظوں کو جگہ نہیں دی۔"

اردو کا تیسرا نام ہندوستانی یا ہندستانی ہے۔ یہ نام اردو کو اس وقت ملا

---

[1] ہندی انتخابات مقدمہ صفحات ۶، ۱۱

جب وہ صرف دہلی کی زبان نہ رہی مسلمانوں کے ہم رکاب ملک کے دوسرے حصوں تک پہنچی اور برصغیر کے ہر صوبے میں تہذیبی و ادبی زبان کی حیثیت سے رائج ہونے لگی۔ یوں تو شاہ جہاں (۱۶۵۸ — ۱۶۲۷) سے پہلے ہی اردو ملک کے گوشے گوشے تک پہنچ چکی تھی لیکن اردو کے لئے ہندوستانی کا استعمال شاہ جہاں کے عہد سے پہلے نہیں دیکھا گیا۔ عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامے میں اردو کو ہندوستانی کے نام سے یاد کرتا ہے اور برج کو ہندی کہتا ہے[۱]۔

"سخن وران فارسی و ہندوستانی بہ نظم و نثر داستان آں رستم آثار بر گذارند و دامن امید بجز ائل عطایا بر آموده اند"

ملا وجہی سب رس (۱۶۳۵ء) میں اردو کو زبانِ ہندوستان لکھتے ہیں:-

"آغاز داستان بہ زبانِ ہندوستان"

مغربی مصنفین نے اردو کو زیادہ تر ہندوستانی ہی کہا۔ اس کے استعمال کی قدیم ترین تاریخ ڈاکٹر گریرسن مسٹر ییل (Yule) کے حوالے سے ۱۶۱۶ء بتاتے ہیں[۲]۔ ٹیری ٹام کوہیٹ نامی شخص کا ذکر کرتا ہے کہ وہ اندوستان یعنی عوامی زبان کا بہت بڑا ماہر تھا۔ فرایر کہتا ہے عدالت کی زبان فارسی ہے عام آدمی "اندوستان" بولتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی عیسوی تک مغربی مصنفین اردو کو ہندوستانی کے نام سے یاد کرتے رہے۔

سب سے پہلے مشہور مستشرق گلبرکرسٹ نے اسے 'مورس' (مسلمانوں کی زبان) کہا۔ وہ ہندوستان سے اپنے والد کو خط لکھتا ہے اس میں کہتا ہے[۳]:-

"ان میں ایک زبان جو بہت اہم ہے مورس ہے۔ یہ لکھی نہیں جاتی اس لئے میں اس پر پوری توجہ نہیں کر سکتا۔ دوسری فارسی ہے وہ اتنی خشک اور غیر دلچسپ ہے

---

[۱] بادشاہ نامہ ج ۱ صفحہ ۴۹۲

[۲] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۳

[۳] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ج ۲۲ صفحہ ۵۰۔

کہ میری توجہ کو جذب نہیں کر سکتی۔"

اس کے بعد یہ نام عام ہو گیا اور مغرب کے مصنف اُردو کو مورس کہنے لگے۔ گریرسن کے بیان کے مطابق اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستانی کو عام طور سے مورس کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔[1]

اُردو، کھڑی بولی، ہندوستانی، مورس ان چار ناموں میں سے 'مورس' مغربی مصنفین کا دیا ہوا ہے۔ برصغیر کے باشندوں نے اردو کو کبھی 'مورس' نہیں کہا۔ میں نے اوپر عرض کیا کہ ہندوؤں نے اُردو کی قدیم شکل کو کھڑی بولی کہا جو صرف بول چال میں کام آتی تھی اور اپنی کم مائیگی کے باعث اس قابل نہ تھی کہ اسے سنجیدہ علمی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جا سکے مغربی مصنفین میں سے گلکرسٹ نے اردو کو کھڑی کے نام سے یاد کیا۔ لیکن ان کا رجحان زیادہ تر ہندوستانی کی طرف رہا! وہ اردو کو ہندوستانی کے نام سے پکارتے رہے۔ مولانا شیرانی فرماتے ہیں:۔

"ہمارے ہاں عام خیال یہ ہے، کہ انگریزوں نے اردو کو یہ نام (ہندوستانی) دیا ہے۔ یہ واقع کے خلاف ہے"۔ لیکن اس میں شاید ہی شبہ کیا جا سکے کہ اس نام کے رواج اور اس کی اشاعت میں مغربی مصنفین کا ہاتھ ہے۔

ڈاکٹر جولس بلاک اُردو کی بابت فرماتے ہیں۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ اُردو کو یہ نام اہل مغرب کے نکتہ دانوں نے دیا۔ ڈاکٹر بیلی کو اس سے اتفاق نہیں وہ کہتے ہیں ڈاکٹر گلکرسٹ کے اس اقتباس سے جو اوپر دیا گیا ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے باشندے اس زبان کو اردو کہتے تھے۔ یہ نام ہندوستانیوں نے دیا۔ گلکرسٹ اسے ہندوستانی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔[2]

---

[1] جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۳

[2] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء صفحہ ۳۹۳

مولانا شیرانی فرماتے ہیں: "اردو کا سب سے قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے۔" ڈاکٹر چیٹرجی کا ارشاد ہے: "اردو کا نام ہندی (قدیم تر ہندوی) ہندوستانی اور اردو کے مقابلے میں زیادہ قدیم ہے۔"[1] مسلمان عالموں نے سنسکرت اور پراکرت کو ہندی یا ہندوی یا زبان ہند کے نام سے یاد کیا ہے۔ البیرونی (۱۰۳۰ء) زبان ہند کی دو قسمیں بتاتے ہیں عوام کی زبان (اپ بھرنش پراکرت) اور خواص کی زبان جو کسی قدر پیچیدہ ہے اور جس میں اصول اشتقاق و تصریف و نکات بیان و بدیع کارفرما ہیں۔ امیر خسرو اس زبان ہند کی بابت فرماتے ہیں:[2]

زبان ہند ہم تازی مثال است — کہ آمیزش در آنجا کم مجال است

گر آئین عرب نحو است و گر صرف — ازاں آئین ہمیں کم نیست یک حرف

ایلیٹ کی تاریخ میں ہے:[3]

"جب اس عہد (اکبری) کا مسلمان لفظ ہندی استعمال کرے تو اس سے اشتباہ ہوتا ہے۔ نظام الدین کا بیان ہے کہ عبد القادر بدایونی نے ہندی کی متعدد تصانیف کا ترجمہ کیا۔ ہم کو معلوم ہے عبد القادر نے دوسری تصانیف کے علاوہ رامائن اور سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ بھی کیا ہے یہ کتابیں براہ راست سنسکرت سے ترجمہ ہوئی ہیں۔ عبد القادر اور فرشتہ دونوں لکھتے ہیں کہ مہابھارت کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اول الذکر اس کو نقیب خاں کی طرف منسوب کرتا ہے اور موخر الذکر فیضی کی طرف۔ یہاں ہندی سے سنسکرت مراد لی جا سکتی ہے ـــــ ایک دوسری جگہ عبد القادر کہتا ہے۔ اتھرویدکا ہندی سے ترجمہ کرنے کو کہا گیا۔ لیکن چونکہ اس کے الفاظ و معانی مشکل تھے

---

[1] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۵۱

[2] دول رانی خضر خاں صفحہ ۳۲

[3] تاریخ ہندوستان جلد ۵ صفحہ ۵۷۰۔

اس لئے اس نے انکار کر دیا۔ بعد میں حاجی ابراہیم سرہندی نے اس کام کو انجام دیا۔ یہاں ہندی سے سنسکرت کے سوا کوئی دوسری زبان مراد نہیں ہو سکتی۔"

شاہ میراں جی شمس العشاق (متوفی ۹۶۴ھ) اُردو کو ہندی کے نام سے پکارتے ہیں۔

یہ بولوں ہندی سب　　اِن ارتوں کے سبب
یو دیکھت ہندی بول　　پر معنی ہیں نپ تول

اِن کے صاحبزادے شاہ برہان الدین جانم (متوفی ۱۵۸۲ء) ارشاد نامے میں فرماتے ہیں:-

عیب نہ راکھے ہندی بول

جعفر زٹلی (متوفی ۱۷۱۳ء) بھی اسے ہندی ہی کہتے ہیں۔

اگرچہ سبھی کوڑہ وکرکٹ است　　بہ ہندی و ہندی زبان لٹ پٹ است

فضلی نے دہ مجلس (۱۷۳۲ء) میں اور افضل بیگ نے تحفۃ الشعراء (۱۷۵۲ء) میں اُردو کو ہندی ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔ میر اثر مثنوی خواب و خیال میں ہندوی لکھتے ہیں:-

فارسی سو ہیں ہندوی سو ہیں　　باقی اشعار مثنوی سو ہیں

ہندی اور ہندوی ایک لفظ کی دو شکلیں ہیں۔ پہلا ہند کی طرف منسوب ہے دوسرا ہندو کی طرف۔ ان الفاظ کا اطلاق عام طور سے ہر خطے اور علاقے کی بول چال کی زبان پر ہوا۔ برصغیر پاک و ہند کی ہر مقامی و علاقائی زبان کو مسلمانوں نے ہندی یا ہندوی کے نام سے یاد کیا۔ عبدالحمید لاہوری نے برج کو ہندی کہا اور شاہ حاتم نے ہندوی:-

"زبانِ ہر دیار را ہندوی کہ آں را بھاکا گویند موقوف نمودہ"۔

ان علاقائی زبانوں میں عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش نہ تھی اس لئے اردو کی قدیم

شکل "ہندی" کے نام سے موسوم ہوئی اور بالآخر ٹھیٹ اردو جس میں عربی و فارسی الفاظ کی ملاوٹ نہ ہو ہندی یا ہندوی کہلائی، انشاء لکھتے ہیں :-

"ہندوی پھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے"

اس کے مقابلے میں عام فہم بول چال کی مخلوط زبان کو اُردو کہا گیا اور نظم کی بھاری بھرکم نصف فارسی اور نصف ہندی زبان کو ریختہ۔ مولانا شاہ عبدالقادر ترجمہ قرآن شریف (۱۲۰۵ھ) میں فرماتے ہیں :-

"اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف کہ عوام کو بھی بے تکلف دریافت ہو۔"

اُردو بول چال تک محدود رہا۔ آپس کی بات چیت میں لوگ اُردو کو اُردو پکارتے رہے۔ کولبروک کے زمانے تک اُردو میں تصنیف و تالیف کا آغاز نہیں ہوا تھا اس لئے اس نے اپنے والد کے نام اس خط میں جس کا حوالہ اوپر دیا گیا اردو کو مورس کہا اور اس کی بابت لکھا کہ وہ تحریر میں نہیں آتی۔ اُردو میں ادب کی ابتدا شعر سے ہوئی اور شعر کی غزل سے۔ امیر خسرو (۱۳۲۵ء) نے سب سے پہلے فارسی آمیز اردو غزل کہی جس کا نام ریختہ پڑا۔ پھر اس تعلق سے اس زبان کو ریختہ کہا گیا جو غزل کے لئے مخصوص ہو چکی تھی۔ سعدی کاکوروی کہتے ہیں۔

سعدی بگفتہ ریختہ در ریختہ در ریختہ — شیر و شکر آمیختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

شاہ مبارک آبرو فرماتے ہیں :-

وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ہے — ان سیتی کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل و حرف — لغو ہیں گے فعل اس کے ریختے میں حرف ہے

میر نے فارسی کی آمیزش کا تناسب ملحوظ رکھ کر ریختہ کی جو قسمیں کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریختہ اُردو کا علم نام نہ تھا۔ شعرا اس کو ریختہ کہتے تھے۔ دوسرے وہ نظم

کی مخصوص اور کسی قدر خود ساختہ زبان تھی۔ بول چال کی فطری زبان عام طور سے اردو کہلاتی تھی۔ ڈاکٹر بیلی اس نتیجے پر پہنچے ہیں[۱]:۔

"اردو کو بات چیت میں اردو زبان اسی وقت سے کہا جاتا رہا جب سے لشکرگاہ اردو کہلائی یہ نام کئی سو سال بعد کتابوں اور تحریروں تک پہنچا۔ اور اس تاریخ سے پہلے پہنچا جب وہ ہمیں کتابوں میں ملا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تنہا لفظ "اردو" زبان کے معنی میں اس زمانے سے کسی قدر بعد کی پیداوار ہے"

دہلی کی زبان ہونے کے باعث امیر خسرو، ابوالفضل اور شیخ بہاؤالدین باجن نے اُردو کو زبان دہلوی کہا۔ دیوان زادہ کے مقدمے میں روزمرّہ دہلی سے شاہ حاتم (متوفی ۱۷۹۱ء) کی مراد اردو زبان ہے:۔

"روزمرہ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیح گویان رند در محاورہ آنند منظور داشتہ"[۲]

اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

زبان ہر دیار تا بہ ہندوی کہ آں را بھاکا گویند موقوف نمودہ فقط روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار کردہ"

حکیم احد علی یکتا لکھتے ہیں[۳]:۔

"نام ہمیں محاورہ خاص باردوے معلی شہرت گرفت۔ لیکن ایں زبان با شروط مذکورہ یافتہ نمی شود مگر در بعضے باشندہائے شاہ جہاں آباد۔"

اُردو ہجرت کر کے گجرات و دکن پہنچی تو گجرات میں گجری کہلائی اور دکن میں دکھنی۔ شاہ برہان الدین جانم فرماتے ہیں۔

جے ہوئے گیان بچاری   نہ دیکھے بھاکا گوجری   (حجۃ البقا)

۱۔ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء صفحہ ۳۹۶

۲۔ دستور الفصاحت صفحہ ۵ مقدمہ

یہ سب کیا گجری زبان

رستمی (۱۶۴۹ء) خاور نامہ میں لکھتے ہیں:۔

خاور نامہ دکنی کیتا ہوں نام

شاہ ملک (۱۶۶۶ء) فرماتے ہیں:۔

دکنی میں بریا ہے صاف (شریعت نامہ)

ان اقتباسات میں گجری سے گجراتی اردو مراد ہے اور دکنی سے دکنی اردو۔ دکن و گجرات کے شعرا اور اہلِ قلم کو جب اس کا احساس ہوا کہ دکن و گجرات کی اردو شمالی ہند کی اردو سے مختلف ہے تو انہوں نے اپنی زبان کو گجری یا دکنی کہا اور شمالی ہند کی اردو کو ہندی یا ہندوستانی۔ؔ اس سے پہلے جب انہیں اس کا احساس نہ تھا وہ اپنی زبان کو ہندی ہی کے نام سے پکارتے تھے چندر بدن و مہیار کا قصہ دکن کے جن شعرائ نے نظم کیا ہے ان میں ایک شاعر بلبل ہے۔ وہ اپنی نظم کی بابت کہتا ہے:۔

حریر ہندوی پر کر تو تحریر
لباسِ پارسی ہے پائے زنجیر

اس کی یہ نظم دکھنی زبان میں ہے۔ چندہ حسینی واقف بیجاپوری شاعر ہے۔ اس نے اس قصے کو نظم کرنا چاہا تو اپنے عجز کا اظہار ان الفاظ میں کیا:۔

مقیمی نے مگر دکنی زباں میں
لکھے ہیں قصہ اک ان کے بیاں میں

لکھا ہے فارسی کوئی رسالہ
یہ سب قصہ کلہے اس میں حوالہ

اگرچہ میں بھی تو اہلِ دکن ہوں
نہیں کچھ ہند کا صاحب سخن ہوں

تتبع فارسی کا میں کیا ہوں
حکایت ہر دو قصوں سے لیا ہوں

ؔ. بہت ممکن ہے کہ یہ نام (ہندوستانی) دکن میں اردو کو ملا تاکہ شمالی ہند کی زبان ہندوستانی جنوبی ہند کی ہندی [illegible] دکھنی سے ممتاز ہو سکے (انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۰۸)

کہتا ہے "یہ قصہ فارسی میں آتشی نے نظم کیا اور مقیمی نے دکھنی اُردو میں۔ ہر چند میں دکن کا باشندہ ہوں اور میرے لئے ہندو (شمالی ہند) کی زبان ہندی (ہندوستانی) میں کچھ لکھنا دشوار ہے تاہم کوشش کی ہے کہ اس نظم کو محاورۂ ہند یعنی شمالی ہندستان کی زبان میں قلم بند کروں۔"

اُردو قدیم زبان ہے مسلمانوں کی ہند میں آمد سے پہلے بھی وہ دہلی میں بولی جاتی تھی۔ اس کا قدیم نام کیا تھا یہ بتانا مشکل ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اس کو اُردو مسلمانوں کی آمد کے بعد کہا گیا اور اس لئے کہا گیا کہ اس نے دہلی کی شاہی فرودگاہ میں جسے اُردوے معلیٰ کہا جاتا تھا، نیا جنم لیا۔ اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ عربی و فارسی الفاظ کے ذخیرے سے علاجِ تہی دامنی کر کے وہ ادبی زبان کے منصب پہ فائز ہوئی اُردو کی نشاۃِ ثانیہ اور حیاتِ نو کا آئینہ دار اس کا نام اُردو ہے اس کو اس کے دوسرے ناموں سے جو حیاتِ نو کے بعد اسے دیئے گئے قدیم ہونا چاہیئے۔ کسی قدیم تاریخ میں نہ ملنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُردو کا نام اردو قدیم نہیں حال کی پیداوار ہے۔ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر جولس بلاک کی رائے ہے کہ اردو ہماری زبان کا قدیم نام ہے۔ وہ فرماتے ہیں[1]:-

"اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اُردو زبان (یہ اس کا قدیم نام ہے)
کس طرح ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچی"

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۵ صفحہ ۷۳۹۔

(۲)

"لسانی سرمایہ"

اُردو کا آغاز کب اور کس جگہ ہوا اور اس کا ماخذ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ طے ہو جانا چاہیئے کہ اُردو سے ہماری کیا مراد ہے۔ وہ کون سی زبان ہے جسے ہم اُردو کہتے ہیں؟ اس میں کئی فائدے ہیں۔ ایک تو آگے چل کر غلط فہمی پیدا ہونے کا خطرہ نہیں رہتا۔ اردو سے ملتی جلتی اور بھی کئی زبانیں ہیں جو آج اردو کے پڑوس میں دائیں بائیں آگے پیچھے بولی جاتی ہیں۔ ایک جستجو کرنے والا ان زبانوں کو اردو سمجھ کر اُردو میں شامل کر سکتا ہے اور ان کی خصوصیات اصل سوال کے طے کرنے میں سدِ راہ بن سکتی ہیں۔ اس لئے زیادہ اچھا یہ ہے کہ شروع ہی میں طے کر لیا جائے کہ ہم کس زبان کا آغاز معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کونسی خصوصیات ہیں جن کے ماخذ کا کھوج لگانے کی ہمیں فکر ہے۔ دوسرے علم و دریافت کا صحیح اور مناسب طریقہ یہ ہے کہ معلوم سے نامعلوم کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ جو بات آج صحیح اور قطعی طور سے ہمیں معلوم ہے اسے بنیاد ٹھہرا کر اُسے دریافت کیا جائے۔ جسے ہم نہیں جانتے۔ جلم

کی روشنی سے وہ علمی کی تاریکی میں ہم قدم رکھ رہے ہیں۔ ہمیں اپنے سفر کا آغاز تاریکی کے کسی نقطے سے نہیں کرنا چاہیئے۔ ہاتھ میں شمع لے کر روشنی سے تاریکی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنا چاہیئے۔ تاکہ ہم بھٹک نہ جائیں اور جیسے جیسے تاریکی دور ہوتی جائے ہم آگے قدم بڑھاتے چلے جائیں اس طرح یقیناً ہم منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

آج جسے اردو کہا جاتا ہے اس کے خط و خال، رنگ و آہنگ کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم اس زبان کو نہیں جانتے جس سے اردو نے جنم لیا۔ اُردو کے موجودہ نقش و نگار کا ہمیں علم ہے لیکن اس کے پرانے رنگ و آہنگ سے ہم ناواقف ہیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے اردو اپنے پورے نکھار سنگھار کے ساتھ دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ علم نہیں کہ اِس زبان کا آغاز انہی اضلاع میں ہوا یا کسی اور مقام میں جہاں سے اسے دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع میں لایا گیا۔ ان میں سے جو باتیں ہمیں معلوم ہیں ان کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ ثابت شدہ حقیقتیں ہیں۔ جو چیزیں ہم نہیں جانتے انہیں جاننے ہوئے چیزوں کی روشنی میں جاننا چاہیئے کوئی بات فرض کر کے اس کے مطابق ثابت شدہ حقیقتوں کو توڑنا مروڑنا مناسب نہیں۔ اس کے برعکس ثابت شدہ حقیقتوں کے مطابق اور ان کے قیاس پر اپنے مفروضات کو ڈھالنا ہمارا فرض ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ کوئی ایسی بات فرض نہ کریں جو موجودہ معلومات اور ثابت شدہ حقائق کے خلاف ہو۔

اُردو آج ہم اس زبان کو کہتے ہیں جو دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع میں عام طور سے بولی جاتی ہے۔ عالم، عامی، بچے، بوڑھے، مرد عورت سبھی کی زبان ہے یہ زبان مشرقی یوپی، بہار، پنجاب، سی پی اور دکن کے شہروں میں بھی رائج ہے لیکن اپنے خاص نکھار کے ساتھ یہ صرف تعلیم یافتہ طبقے میں بولی جاتی ہے۔ دہلی اور یوپی

کے مغربی اضلاع میں یہ بول چال کی زبان بھی ہے اور ادب و شعر کی زبان بھی مدھر مقامات میں (چند بڑے بڑے شہروں کو چھوڑ کر) اس کو ادبی، تحریری یا تہذیبی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ بول چال کی زبانیں اور ہیں۔

ہر زبان کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جن سے زبان تشکیل پاتی ہے یہ خصوصیات مجموعی طور سے صرف اس زبان میں ہوتی ہیں۔ الگ الگ ان میں کی ہر خصوصیت، ہو سکتا ہے کہ کسی دوسری زبان میں بھی ہو لیکن مل ملا کر یہ خصوصیات صرف اسی زبان میں ہو سکتی ہیں۔ ہم زبان کو اس کی خصوصیات سے جانتے ہیں اور دوسری زبانوں سے اس کو ممتاز اور مختلف زبان ان خصوصیات ہی کی وجہ سے سمجھتے ہیں۔ کسی دو زبانوں میں فرق و امتیاز ان کی خصوصیات سے کیا جاتا ہے ورنہ ایک خاندان کی زبانوں میں مشترک صفات بھی ہوتی ہیں جو اس خاندان کے تمام افراد میں پائی جاتی ہیں۔ اردو کا آغاز کب ہوا؟ بظاہر یہ سوال بے معنی ہے اردو دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح ایک زبان ہے جو نامعلوم زمانے سے ترقی کرتی آئی ہے۔ اس کا آغاز کیا؟ ہاں! یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اردو نے اپنا موجودہ روپ کب اختیار کیا۔ اردو جو غیر معلوم زمانے سے ترقی کرتی، اور رنگ بدلتی آئی ہے اس میں موجودہ رنگ کب آیا؟ اس سے پہلے اس کی شکل کیا تھی؟ موجودہ رنگ عبارت ہے اس کے لفظی، صوتی، صرفی، نحوی سرمایہ سے جس میں اردو کی خصوصیات بھی شامل ہیں اور مشترک صفات بھی (یعنی اردو زبان کے وہ الفاظ، آوازیں زیادہ ہے) اور صرفی نحوی قاعدے بھی ہیں جو اردو کے ہیں اور صرف اردو کے ہیں اور وہ بھی جو اردو اور اس کی پاس پڑوس کی زبانوں کے مابین مشترک ہیں۔ مثلاً وہ کرتا ہے، میں "وہ" اور "تا" اردو کے ساتھ خاص ہیں اور "کر" اور "ہے" اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی ہیں ("ہے" "ہے" کی صورت میں)

اُردو کی موجودہ شکل متعین کرنے سے پہلے اردو کا لسانی تجزیہ ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اُردو کی خصوصیات کیا ہیں اور وہ کون سی صفات ہیں جو اردو اور پڑوس کی دوسری بولیوں میں مشترک ہیں۔ یوں تو اردو مجموعہ ہے اپنی خصوصیات اور مشترک صفات کا لیکن اصل میں اردو اس کی خصوصیات کا نام ہے۔ اردو کے آغاز کا مسئلہ اُردو کی خصوصیات کے آغاز کا مسئلہ ہے۔ اردو کی خصوصیات اس کے خط و خال ہیں جب تک اُردو کے خط و خال نہیں ابھرے اُردو وجود میں نہیں آئی اور اس میں اپنی ہم رشتہ اور عزیز بولیوں سے الگ منفرد اور مستقل بولی کا ڈھنگ نہیں جھلکا۔ درخت کا تنا ایک ہوتا ہے جو کچھ عرصے تک ایک رہتا ہے اس کے بعد اس میں دائیں بائیں بہت سی شاخیں پھوٹتی ہیں جو تنے سے رنگ روپ میں مختلف ہوتی ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک شاخ کو لے کر ہم پوچھیں کہ یہ کب پیدا ہوئی تو ہر صاحب شعور اس کا آغاز اس مقام سے بتائے گا جہاں شاخ تنے سے جدا ہوئی۔ شاخ تنے سے کب جدا ہوئی یہ بتانا آسان ہے۔ یہ نظر کا کام ہے شاخ ہر ناظر کو تنے سے پھوٹتی اور نکلتی نظر آتی ہے۔ وہ انگلی رکھ کر بتا سکتا ہے۔ کہ یہاں سے شاخ نے جنم لیا۔ لیکن زبان کا حال ذرا اس سے مختلف ہے۔ اس کے تنے یعنی اصل کا پتہ لگانا اتنا آسان نہیں۔ یہاں نظر کے ساتھ خبر کی ضرورت بھی ہے بصر کے ساتھ بصیرت بھی چاہیئے۔ درخت کو جڑ کی طرف سے دیکھیے یا پھننگ کی طرف سے نقطۂ اتصال و انفصال صاف نظر آجاتا ہے۔ نیچے سے دیکھئے تو پہلے تنے پر نظر پڑتی ہے اس کے بعد نقطۂ انفصال سامنے آتا ہے یعنی وہ مقام جہاں سے شاخیں پھوٹیں اور دائیں بائیں پھیلیں۔ اوپر سے دیکھئے تو پہلے گھنی چھتنار شاخیں بانہہ پھیلائے نظر آتی ہیں اس کے بعد وہ مقام آتا ہے جہاں سمٹ کر یہ ایک ہوئیں۔ لیکن زبان میں جو پھیلاؤ ہے وہ کچھ اور طرح کا ہے۔ اسے سمجھنے اور جاننے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ ملتی جلتی بولیوں کا ساتھ ساتھ تقابلی مطالعہ کیا جائے اور ان

میں جو صفات مشترک ہوں انہیں الگ کرلیا جائے یہ ان ملتی جلتی اور باہم متشابہ بولیوں کا منبا یعنی اصل ہو گی۔ ان کے علاوہ جو خصوصیات بچیں انہیں اس اصل کی مختلف شاخیں یعنی بھانت بھانت کی بولیاں سمجھئے۔

اُردو کا تمام تر سرمایہ یہ ہے۔

(۱) مفرد الفاظ جو دو قسم کے ہیں۔ کچھ عربی فارسی وغیرہ زبانوں سے لئے گئے ہیں جنہیں ہم دخیل کہتے ہیں، کچھ اس قدیم زبان کے ہیں جس سے اُردو نے ارتقا پایا۔ یہ دو طرح کے ہیں۔

(الف) تدبھو۔ وہ الفاظ جو اپنی اصل سے کسی قدر بدلی ہوئی صورت میں اُردو میں استعمال ہوتے ہیں جیسے اچنبھا، کھیں وغیرہ

(ب) تت سم۔ جدید الفاظ جو جوں کے توں اُردو میں مستعمل ہیں۔ اُردو نے اپنے مزاج کے مطابق ان میں کوئی تصرف نہیں کیا۔ جیسے راجا پرجا وغیرہ۔

(۲) مرکب الفاظ۔ یہ بھی دو طرح کے ہیں (الف) غیر زبان کے مرکبات جیسے بے ایمان۔ دل پسند وغیرہ (ب) اُردو مرکبات جیسے اٹکل پچو۔ سرکا پادھاپی۔

(۳) بنیادی الفاظ یعنی مادے جن سے اسماء، افعال اور اس کے مشتقات وضع ہوتے ہیں۔ جیسے۔ کر۔ اٹھ۔ بیٹھ۔ پڑھ۔ لکھ وغیرہ۔

(۴) تعمیری کلمے، ان کے سہارے مادّوں سے افعال اور مشتقات وضع کئے جاتے ہیں۔ جیسے 'نا' 'تا'۔ 'گا' وغیرہ کرنا، کرتا، کرے گا، میں۔

(۵) حرف ربط۔ انھیں حروف معنوی، حروف مغیرہ یا اعرابی لاحقے بھی کہتے ہیں۔ ان کی مدد سے اسم کو گردانا جاتا ہے سے، پر، میں، تک، کا، کو ان میں سے چند ہیں۔

(۶) ضمیریں، اسماء موصولہ، کنایات وغیرہ جیسے۔ وہ۔ جو۔ کتنا۔ کیسا۔ وغیرہ

(۷) صرفی نحوی اصول اور قاعدے جو اسماء و افعال کے بنانے، گردانے اور الفاظ کی صحیح ترکیب و ترتیب میں کام آتے ہیں مثلاً الف پر ختم ہونے والے مذکر اسماء، ضمائر اور موصولات کا غیر فاعلی حالت میں بدل جانا۔ جیسے گھوڑے کی گھاس ۔ اُس، جس، کس، وغیرہ۔

اُردو کے ترکیبی اجزا جن سے اردو بنی ہے، یہ ہیں۔ یہ سب ایک حیثیت کے نہیں۔ ان میں سے کچھ اہم ہیں اور کچھ غیر اہم۔ غیر اہم وہ ہیں جو زبان کی تعمیر و تشکیل میں دخیل نہیں یعنی مفرد الفاظ جو کسی اجنبی زبان سے اردو میں درآمد کئے گئے اور اردو کے اپنے الفاظ جو قریبی زمانے میں اُردو میں داخل ہوئے اس لئے رچ بچ کر اردو نہیں بن سکے یعنی دخیل اور سنسکرت کے تت سم الفاظ لسانی طور پر غیر اہم ہیں۔ زبان کے مزاج اور اس کی شخصیت کی تعمیر میں اُن الفاظ کو دخل نہیں۔ ان کو زبان کے اصلی سرمایہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ الفاظ اتنے پرانے نہیں جتنی پرانی زبان ہے۔ ان کی تاریخ میں وہ کہانی نہیں جو زبان کی تاریخ میں ہے۔ ایک اجنبی کی طرح یہ الفاظ زبان میں چپکے سے آئے اور بس گئے۔ زبان کی تاریخ ان کی تاریخ سے الگ ہے۔ زبان کو اپنی زندگی کے جن دوروں سے گزرنا پڑا یہ الفاظ ان دوروں سے نہیں گزرے۔ وہ زبان کے غیر شہری باشندے ہیں اس لئے زبان کے آغاز و نشوونما کے سلسلے میں ان کا ذکر نہیں آسکتا یا کم سے کم نشوونما کے ابتدائی مراحل میں ان کا ذکر نہ ہونا چاہیئے۔ زبان کے بہت سے اتفاقی منازل ہیں۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت سی کروٹیں بدلیں۔ اس سفر میں اس کے سامنے بہت سے موڑ آئے۔ دخیل اور تت سم الفاظ ان منزلوں، کروٹوں اور موڑوں میں سے کسی ایک موقع پر زبان میں داخل ہوئے اس میں شاید ہی کسی کو شبہ ہو۔ اس لئے جب یہ موقع آئے تو ان الفاظ کا ذکر کیا جائے۔ بے محل اور بے موقع ان کو لے بیٹھنا مناسب نہیں۔ پروفیسر میکس مولر کہتے

ہیں کہ زبانوں کی تقسیم اور ان کے رشتوں اور قرابتوں کی تعیین ان کی صرفی نحوی ساخت کے مطابق کی جاتی ہے فرہنگ الفاظ کی اس سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں[1]۔

زبانیں ایک طرح کی نہیں ہر زبان کی قواعدی ساخت دوسری زبان سے مختلف ہے۔ زبانوں کے رشتے ان کی ساخت سے معلوم کئے جاتے ہیں اور ان دو یا دو سے زیادہ زبانوں کو ایک ہی رشتۂ قرابت میں پرو دیا جاتا ہے جن کی ساخت ایک جیسی ہے، جن کے بنیادی اور تعمیری الفاظ ایک جیسے ہیں۔ حروف ربط جن کے ملتے جلتے ہیں، جن کے صرفی و نحوی قاعدوں میں یکسانی کا رنگ جھلکتا ہے۔ زبان کی ساخت میں صرف یہی تین چیزیں شامل ہیں۔ زبان اصل میں انہیں تین چیزوں کا نام ہے۔ جن سے اس کا رنگ نکھرتا ہے شکل و صورت بنتی ہے اور وہ ایک مستقل اور منفرد شخصیت حاصل کر کے ایک آزاد زبان کی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ دخیل الفاظ زبان کی ساخت پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ ان کی مدد سے زبان کے تعمیری دور روشنی میں نہیں آتے۔ ایک قوم کے سیاسی تغلب کی طرف رہنمائی ہو جاتی ہے جس کے زیر اثر یہ بدیسی الفاظ زبان میں داخل ہوئے اردو میں فارسی عربی الفاظ کی بھرمار ہے اگر ہم اپنی تحقیق و جستجو کی عمارت ان لفظوں پر کھڑی کریں تو اس سے دو نتیجے برآمد ہوں گے۔ ایک یہ کہ اردو عربی۔ یا ایرانی خاندان کی زبان ہے دوسرے اس کا آغاز اس زمانے میں ہوا جب مسلمان ہندوستان آئے۔ اس سے پہلے اس کا وجود نہ تھا۔ مسلمانوں نے فارسی عربی الفاظ کی آمیزش کے بعد اردو زبان کا کالبد تیار کیا۔ یہ دونوں نتیجے غلط، بے بنیاد اور گمراہ کن ہیں۔

پاس پڑوس کی بولیوں میں سے اردو ہریانی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی سے بہت مشابہ ہے ان کے الفاظ کا بیشتر سرمایہ ایک جیسا ہے صرفی نحوی قاعدوں

---

[1] ملاحظہ فرمایئے سائنس آف لینگویج دوسرا لیکچر صفحات ۹۰، ۸۶ (اشاعت ششم)

میں بڑی حد تک یکسانی ہے اس کے علاوہ پنجابی، راجستھانی، اودھی سے بھی اردو بہت کچھ ملتی ہے۔ اردو کو ان بولیوں اور زبانوں سے جن لفظی، صوتی، صرفی اصول و سرمایہ کی بنا پر مستقل مختلف زبان سمجھا جاتا ہے وہ اُردو کی لسانی خصوصیات ہیں ان خصوصیات کا علم بہت ضروری ہے۔ اردو کے آغاز کی دریافت کے لئے بھی اور زبان و ادب کے ارتقا کو سمجھنے کے لئے بھی علم طور سے اردو کے حسب و نسب سے بحث کرنے والوں سے بھول ہوئی کہ اردو کی خصوصیات متعین کئے بغیر انہوں نے اُردو کی ابتدا اور اس کے نشو و نما کا کھوج لگانا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو کا آغاز اس وقت مان لیا گیا جب اردو نہ تھی اور اس مقام سے مان لیا گیا جہاں اردو کا تخم نہیں ڈالا گیا تھا۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے اُردو کی حسب ذیل خصوصیات شمار کرائی ہیں[1]:۔

(۱) کا ۔ کی	اضافت کے لئے جیسے:۔	حامد کا گھوڑا ۔ محمود کی کتاب
(۲) سے ۔	علامت جر و آلہ جیسے:۔	لاٹھی سے مارا ۔ گھر سے روانہ ہوا
(۳) میں ۔ پر	ظروف کے لئے جیسے:۔	گھر میں ــ کوٹھے پر
(۴) نا	علامت مصدر جیسے:۔	کرنا ــ پڑھنا
(۵) تا	علامت حالیہ ناتمام و فعل حال جیسے:۔	چلتا پھرتا ۔ وہ دوڑتا ہے
(۶) "ا"	علامت حالیہ تمام و فعل ماضی جیسے:۔	کھلا (کھلا ہوا) ۔ چلا ۔ رہا وغیرہ
(۷) گا	علامت استقبال جیسے:۔	جائے گا ــ پڑھے گا۔
(۸) س	اسمائے عامہ میں غیر فاعلی حالت کی علامت جیسے:۔	اس (وہ) ــ جس (جو) کس (کون) ــ اس (یہ)

[1] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۵۴۔

ان میں ذیل کی خصوصیات کا اور اضافہ کیجیے۔

(۹) کو — علامت مفعول — حامد نے محمود کو مارا۔

(۱۰) نے — علامت فاعل

(۱۱) تک — علامت جر — گھر تک

(۱۲) "ں، ون" — اسماء مطلقہ میں غیر فاعلی حالت کی علامت جمع — بچوں نے لڑکے کو مارا۔

اُردو کا لسانی سرمایہ ذیل کے تین اجزا پر مشتمل ہے۔

(الف) مفرد الفاظ جن میں اسماء و صفات دونوں شامل ہیں۔ جیسے گھوڑا۔ بچہ۔ اچھا۔ بُرا۔

(ب) افعال و حروف۔ افعال میں تمام بنیادی الفاظ آگئے اور حروف میں تمام معنوی اور تعمیری حروف۔

(ج) اصول صرف و نحو۔

ان میں سے مفرد الفاظ کا جو دوسری زبانوں سے اُردو میں لے لئے گئے اُردو کے ماخذ اور اس کے آغاز سے کوئی تعلق نہیں اس لئے ان کا ذکر اس سلسلے میں نہ ہونا چاہیئے۔ باقی جو کچھ بچا سب اُردو کا ہے اُردو اگر جسم ہے تو یہ اس کا گوشت پوست ہیں۔ اردو جیسے ہے اُردو کا یہ سرمایہ بھی اسی وقت سے ہے اردو کا آغاز اس کا آغاز ہے اور اردو کا ارتقا اس کا ارتقا۔ اردو لفظوں اور آوازوں کے اس سرمایہ کے سوا کوئی چیز نہیں۔ لیکن اس میں جو چیز خاص اردو کی ہے، جس سے اس کی ہیئت بنتی ہے اور جس سے اس کی شخصیت و انفرادیت کا قیام و بقا ہے وہ اس کی خصوصیات ہیں۔ جب سے اُردو میں یہ خصوصیات پیدا ہوئیں اُس نے دوسری بولیوں سے الگ ایک زبان یا بولی کی حیثیت حاصل کی اس سے پہلے اُردو دوسری بولیوں سے ممتاز نہ تھی اس میں اور دوسری بولیوں

میں خط فاصل نہیں کھینچا جا سکتا تھا۔ ان خصوصیات کا اُبھرنا اور نمایاں ہونا اردو کی ابتدا یا اس کا آغاز ہے۔

یہاں دو ایک غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے جو بار بار دہرائے جانے کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں کچھ اس طرح جم کر بیٹھ گئی ہیں کہ نکلنے کا نام نہیں لیتیں۔ ایک غلط فہمی جسے میں سب سے زیادہ خطرناک اور لسانی بحثوں میں حقیقت سے بھٹکانے والی سمجھتا ہوں یہ ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کو جوڑ کر کوئی تیسری نئی زبان وضع کی جا سکتی ہے جو پہلی دو زبانوں سے جدا اور آزاد ہو۔ دو یا دو سے زیادہ رنگوں کی آمیزش سے ایک نیا اور دونوں سے مختلف رنگ ضرور تیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دو زبانوں کی ترکیب سے کسی تیسری نئی زبان کی تعمیر ناممکن ہے۔ زبان نامی اور ذی حیات چیز ہے جو دوسری نامی چیزوں کی طرح مسلسل تغیر و ارتقا کے زیر اثر وجود میں آئی۔ پاس پڑوس کی زبانوں سے غذا حاصل کر کے ان کی فضا میں سانس لے کر وہ فربہ اور توانا تو ہو سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ مل کر کسی تیسری زبان کو جنم دینا اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایک زبان کسی ایک مخصوص و محدود علاقے میں مدتوں بولی جاتی رہی، زمانے کے ساتھ اس میں تبدیلیاں ہوئیں۔ کچھ عرصے کے بعد کسی مجبوری سے مثلاً کثرت آبادی کے باعث یا باہمی آویزش کی وجہ سے یا غذا کی تلاش میں اس زبان کے بولنے والوں میں سے بہت سے لوگ ترکِ وطن کر کے دوسرے مقامات پر جا بسے اور ایک دوسرے سے اتنی دور ہو گئے کہ ان میں میل ملاپ اور ارتباط کے مواقع نہ رہے۔ جدائی کے وقت یہ لوگ ایک زبان بولتے تھے جو سب کے لئے قابل فہم تھی۔ جدائی کے بعد حسب قاعدہ ان کی زبان بدلنا شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ اتنی بدل گئی کہ وہ اپنی اصل سے دور جا پڑی۔ ادھر اصل زبان بھی ناموسِ ارتقا کے زیر اثر برابر متغیر ہوتی رہی تھی۔ اصل اور فرع کی تبدیلیاں ایک کو دوسری سے دور لے گئیں یہاں تک کہ اصل فرع سے اور

ایک فرع دوسری فرع سے بچھڑتے بچھڑتے بالکل اجنبی بن گئیں اور چند بنیادی ناقابل تغیر عناصر کے سوا ان میں کوئی چیز مابہ الاشتراک نہ رہی۔ صرف یہی ایک صورت زبان میں تنوع کی ہے جس سے زبان کی متعدد نئی شاخیں اور کونپلیں پھوٹتی ہیں جو اس زبان کی بولیاں کہلاتی ہیں۔ زبان اصل ہوتی ہے اور بولیاں اس کی شاخیں۔ زبان سرچشمے کی حیثیت رکھتی ہے اور بولیاں چھوٹی چھوٹی نالیوں یا جدولوں کی طرح ادھر ادھر پھیلتی جاتی ہیں۔ یہ سب بولیاں ایک حیثیت کی نہیں ہوتیں جو بولی اصل زبان یا اپنی ہمسر شاخ سے مکانی طور پر قریب ہوتی ہے وہ لسانی طور پر اس سے زیادہ مشابہ ہوتی ہے جو دور ہوتی ہے وہ لسانی مراتب کے لحاظ سے بھی دور ہو جاتی ہے ۔ ایم ایڈ منڈس نے زبان کے تنوع کو سمجھاتے ہوئے لکھا ہے۔ فرض کیجیے الف مرکزی زبان ہے۔ ب ۔ ج ۔ د اس کی شاخیں ہیں جو ایک ہی رخ پھیلتی چلی گئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں 'الف' اور 'ب' میں باہمی ارتباط کے مواقع الف ۔ ج اور الف ۔ د کے مقابلے میں زیادہ ہیں، اسی طرح ب ۔ ج میں جو ایک اصل کی دو شاخیں ہیں مشترک عناصر ب ۔ د کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے۔ ب ۔ ج کا مشترک سرمایہ ہو سکتا ہے اتنا ہی ہو جتنا ج ۔ د کا ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ وہی ہو جو ج ۔ د کے مابین مشترک ہے۔ 'الف' اور 'د' ہر چند ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ لیکن ب ۔ ج نے ان کے درمیان رابطہ قائم کر کے اس مکانی فاصلے کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے جب تک ب ۔ ج اپنی جگہ ہیں۔ اس کا امکان کم ہے کہ ا ۔ د بچھڑیں اور ایک دوسرے کے لیے ناقابل فہم نہ رہیں۔ لیکن 'ب' اور 'ج' کے درمیان سے ہٹ جانے کے بعد 'الف' اور 'د' ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن سکتے ہیں[1]۔

زبان یک بیک وجود میں نہیں آتی اس میں ارتقا ہوتا ہے۔ زبان زبان کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کا یہ سمجھنا اگر غلط ہے کہ زبان آپ ہی آپ پیدا ہوئی تو

[1] مقدمہ تقابلی لسانیات بحوالہ ایم ایڈ منڈس صفحہ ۳۱

کسی ایک زبان کے موجودہ روپ کو لے کر یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ قدیم ترین زبان ہے
زبان کا آغاز جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اس کے موجودہ خط و خال کا ابھرنا اور نمایاں ہونا ہے۔
کہ وہ اپنی اصل سے ممتاز ہو جائے اور اس میں اور اس کی ہمسر بولیوں میں فرق کیا جا سکے۔
اگرچہ اس ابھار اور نکھار کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں کی جا سکتی لیکن ہر زبان کی زندگی
میں ایک ایسا دور آتا ہے جب اس کے خط و خال اور اس کی امتیازی خصوصیات
ابھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ ہم اس دور کو اپنی زبان کا یوم میلاد قرار دے سکتے
ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ اس زبان کا آغاز اس دور کے لگ بھگ ہوا۔ زبان کے آغاز کے
اس کے سوا کوئی معنی نہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ آغاز نہیں ارتقا ہے اس
لئے میں نے ابتدائی سطروں میں عرض کر دیا تھا کہ اردو کا آغاز کب ہوا۔ یہ سوال
بے معنی ہے۔ ہاں! یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اردو نے اپنا موجودہ روپ کب اختیار
کیا۔ بنگالی، گجراتی، پنجابی، سندھی کی طرح اردو بھی ایک مستقل اور آزاد زبان ہے اردو
کے ابھار اور نکھار کی نوعیت بھی وہی ہے جو ان زبانوں کے نکھار اور ابھار کی ہے۔ خاص طور
سے اردو کے آغاز کا ذکر کر کے مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے جو ایک تاریخی واقعہ
ہے اس کا جوڑ لگانا کسی طرح بھی صحیح یا مناسب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ایک زبان کے بولنے والے ترکِ مقام کر کے جب کسی دوسری جگہ جاتے ہیں تو
ایک عرصے تک ان کی زبان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اس کے بعد دھیرے دھیرے تبدیلیاں
رونما ہوتی ہیں اور جب یہ تبدیلیاں بڑھ جاتی ہیں۔ تو زبان متعدد بولیوں میں بٹ جاتی
ہے۔ ایک زبان کی کئی شاخیں ہو جاتی ہیں۔ دو بولیوں کا مشترک سرمایہ ان کے مخصوص اختلاف
پیدا کرنے والے سرمایہ سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ دو ہمسر بولیوں
کا مشترک سرمایہ ان کے اور ان کی اصل یعنی اس زبان کے درمیان بھی مشترک ہو جس
نے ان بولیوں کو جنم دیا۔ لیکن ابتدائی مراحل میں امتیاز پیدا کرنے والے سرمایے کے

مقابلہ میں مشترک سرمایہ زیادہ ہونا چاہیئے۔ اس لئے دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے درمیان رشتہ دریافت کرنے کے لئے مشترک سرمایہ کی کثرت یا قلت کو رہنما بنانا صحیح نہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ بنگالی اور میتھلی میں آج مشابہتیں ہیں۔ چودھویں صدی عیسوی میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ لہذا بنگالی میتھلی کی ماں ہے یا اس کے برعکس میتھلی نے بنگالی کو جنم دیا غلط ہے۔ لسانی سرمایہ میں دو زبانوں کی شرکت یا ان کے مشترک سرمایہ کی کثرت اپنی جگہ اس امر کا ثبوت نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک زبان اصل ہے اور دوسری اس کی فرع۔ سرمایہ میں اشتراک دو ہمسر بولیوں میں بھی ہوتا ہے اس کا فیصلہ کہ ان بولیوں میں سے کون سی اصل ہے، مشترک سرمایہ کی بنیاد پر نہیں ہو سکتا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یہ دو بولیاں اجنبی نہیں عزیز ہیں، غیر نہیں اپنی ہیں۔ ان کی قرابت کس قسم کی ہے؟ اپنایت کی نوعیت کیا ہے یہ طے کرنے کے لئے ان کے اس سرمایہ کو دیکھنا ہو گا جو ان کے درمیان اختلاف کا باعث بنا اور جو انہیں ایک دوسرے سے دور لے گیا۔

ایک زبان میں اختلاف رونما ہونے کی دو صورتیں ہیں جن میں سے ایک زیادہ عام اور ہمہ گیر ہے۔ گردوپیش اور خاص طبعی حالات کے زیر اثر زبان کے صوتی اور صرفی و نحوی سرمایہ میں تراش خراش ہوتی رہتی ہے لسانیات کی اصطلاح میں اسے تخت صوتی (PHONETIC DECAY) کہتے ہیں۔ اردو علامتِ اضافت 'کا' اور 'را' کو لیجیے۔ اردو جس زبان سے ارتقا پاتی ہے اس کی کسی قدیم ترین شکل (اپ بھرنش) میں 'کاز' اور 'کیر' (سنسکرت کاریہ) علامتِ اضافت کے طور پر مستعمل تھے۔ چند بردائی کی پرتھی راج راسو کی زبان قدیم کھڑی بولی یا قدیم اردو کی معاصر زبان ہے۔ اس میں 'کیرا' اور 'کیری' (کا اور کی کے معنی میں) عام طور سے استعمال ہوتے ہیں۔ ہیم چندر نے 'کیر' کا ذکر کیا ہے۔

بقول ڈاکٹر مجمندار کر یہ لفظ اپ بھرنش میں ملکیت یا تعلق ظاہر کرتا تھا۔ کبیر داس اور تلسی داس کے یہاں کیرٗ کی جگہ کرا اور کیری ہے۔ کیرٗ اور کیری کا سراغ دکنی اردو میں بھی ملتا ہے۔ امین دکنی کا مصرعہ ہے۔

جو قاصد کیرے ہتھ نامہ چڑایا

قاصد کیرے ہتھ = قاصد کے ہاتھ

غواصی کہتا ہے :۔

کہ ہے پاکری مرد کیرا سنگا۔

مرد کیرا = مرد کا

اردو کا 'کا' اور 'را' قدیم 'کار' اور 'کیرے' تحت صوتی کے زیر اثر بنا اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ 'کا' اور 'را' اب اردو کے ہیں۔ اردو کے مخصوص سرمایے میں شمار ہوتے ہیں اور اردو کو اس کی ہمسر بولیوں سے ممتاز بناتے ہیں۔ یہ کلمے کار اور کیر کی شکل میں پہلے بھی موجود تھے اور قدیم اردو کے ساتھ اس کی معاصر بولیوں قدیم برج، گجراتی وغیرہ میں مستعمل تھے جب اردو کا روپ نکھرا اور اس کے خط و خال ابھر کر نمایاں ہوئے تو کار، کیر وغیرہ قدیم الفاظ زبان کی خراد پر چڑھ کر 'کا' اور 'را' کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ آج کا 'ا' اور 'را' وغیرہ صورت بدلے ہوئے الفاظ کو دیکھ کر ہم یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ 'کار' اور 'کیر' سے ڈھلے ہیں۔ جس زبان میں 'کا' اور 'را' کی یہ قدیم شکلیں کسی زمانے میں رائج تھیں یا آج رائج ہیں وہ اردو کی موجودہ شکل سے زیادہ قدیم ہے۔

یہ صرف ایک مثال ہے۔ زبان کے مخصوص سرمایے کا جس کی بنا پر زبان کی انفرادیت اور اس کی آزاد جداگانہ شخصیت کا دعویٰ کیا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح تجزیہ کرنے کے بعد اس کے اصل و ماخذ نیز آغاز کی بابت کوئی صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کا فیصلہ قطعی ہوگا اور اسے لسانیاتی اور حکمیاتی بنیادوں پر استوار کہا جا سکے گا۔

'کا' اور 'را' کے بارے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ 'کار' اور 'کیر' سے بنے۔ 'کار' اور 'کیر' 'کا' اور 'را' سے زیادہ قدیم ہیں۔ زبان تحت صوتی کے زیر اثر برابر ترشتی رہی اس کا میلان تخفیف، تسہیل نیز اختصار کی طرف رہا۔ اس لئے کہنا ہے کہ 'کا' اور 'را'، 'را' کا مخفف فتحہ 'ر' کی جگہ ہے۔ نیا اضافہ شدہ حرف نہیں) وضع کئے گئے اس کے برعکس 'کا' 'را' سے 'کار' اور 'کیر' نہیں بنے۔ لیکن جہاں تخفیف کا عمل نہیں ہوا اور جدا جدا دو مختلف کلمے دو زبانوں میں مستعمل ہوں وہاں یہ فیصلہ کہ ان میں سے کونسا کلمہ قدیم ہے کون ساجدید کس بنیاد پر کیا جائے گا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ زبان کا ایک عام اصول ابدال ہے یعنی ایک آواز کا دوسری آواز سے بدل جانا۔ مثلاً 'و' کا 'ب' ہو جانا یا 'ک' کا 'گ' سے بدل جانا۔ ابدال کے خاص خاص قاعدے ہیں جو ابدال کے رخ اور اس کے میلان کا پتا دیتے ہیں۔ یہ قاعدے مختلف زبانوں کے تقابلی مطالعے کے بعد اہل علم نے وضع کئے۔ ان قاعدوں کی مدد سے یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ دو مختلف کلمات میں سے اصل کون ہے۔ اور کس نے کس کو جنم دیا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے میں اردو 'را' اور پنجابی 'ڈا' کی مثال پیش کروں گا۔ یہ دو کلمے حاضر اور متکلم ضمیروں میں لاحقہ اضافت کے طور پر اردو اور پنجابی میں مستعمل ہیں:۔

(اردو)	(پنجابی)
تیرا	تواڈا
تمہارا	تساڈا ۔ تہاڈا
میرا	ساڈا
ہمارا	اساڈا

یہ کلمے بظاہر مختلف معلوم ہوتے ہیں ایک دوسرے سے ماخوذ نظر نہیں آتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پنجابی 'ڈا' جیسا کہ ڈاکٹر بھنڈارکر نے لکھا ہے، 'را' کا بدل ہے۔

ان کا بیان ہے کہ 'ر' اور 'ڈ' کے تلفظ میں اشتباہ و اختلاط کے باعث اکثر ان میں تبادلہ ہوا۔[1] 'ر' نے 'ڈ' کی جگہ لی اور 'ڈ' نے 'ر' کی۔ لیکن یہاں 'ر' زیادہ قدیم ہے اور 'ڈ' سے پہلے کی ہے۔ قدیم سنسکرت اور پراکرت کلمات کا یہ اشتراک سے 'ر' کی بآسانی توجیہ ہو جاتی ہے اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ 'ر' نے اول اول پنجابی ضمیروں میں 'ڈ' کی شکل اختیار کی اس کے بعد 'ڈ' نے 'د' کا روپ دھار لیا اور غائب کی ضمیروں نیز دوسرے کلمات میں مصدر کی علامت استعمال ہونے لگا۔ ڈاکٹر ہیورنلے کے قول سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ جدید آریائی زبانوں میں ر، ل، ٹ نے کہیں کہیں 'ڈ' کا روپ اختیار کر لیا ہے۔[2]

یہ قدیم کلمات کا ارتقا ہے۔ اپنی اصل سے جدا ہونے کے بعد بولیاں اسی انداز سے ارتقا پا کر پائیں کہیں تراش خراش کر بدلتی اور اصل زبان سے الگ ایک منفرد شخصیت کی مالک بنتی ہیں۔ یہ بیسوں ہیں تغیر و تبدل نتیجہ اصول ارتقا یعنی تحت صوتی کے زیر اثر عمل میں آتا ہے لیکن کبھی کبھی نئی بولیاں پاس پڑوس کی قریب یا بعید، عزیز یا غریب، اپنی یا پرائی زبانوں سے کچھ الفاظ اور کلمات مستعار لے کر اپنا لیتی ہیں اور اس طرح اپنے قدیم سرمایہ میں جو انہیں اپنی اصل سے ترکے میں ملا تھا، اضافہ کر کے راہ ترقی پر گامزن ہوتی ہیں۔ پہلی صورت میں کچھ کھو کر انہوں نے ترقی کی تھی اور ایک منفرد و آزاد شخصیت پائی تھی۔ اس صورت میں کچھ پا کر ترقی کی۔ لیکن زبان کی بناوٹ اور اس کی صرفی نحوی ساخت پر اس اخذ اور استفادہ کا اثر بہت کم ہوتا ہے زبان کا ڈھانچہ زیادہ تر وہی رہتا ہے باہر سے آئی ہوئی چیزیں اس کی فطرت میں دخیل نہیں ہوتیں۔ زبان، الفاظ اور مفرد کلمات جتنے چاہے مستعار لے کر ان سے اپنی تہی دامنی کا علاج کرے صوتی حرفی نحوی خصوصیات کا ان رہتا ہے، مستعار الفاظ چپکے چپکے اس کے اندر اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ اسے خبر تک نہیں ہوتی۔

---

[1] ولسن لیکچرز صفحہ ۲۶۰
[2] گوڈین زبانوں کی تقابلی گرامر صفحہ ۱۲۔

بہرحال کم ہی سہی اضافے کے بعد بھی بولیوں میں اختلاف رونما ہوا پنجابی نے کانو اردو سے لیا۔ اس کا اپنا اضافی کلمہ جو اسے اپنی اصل سے ملا "را" ہے جسے کاٹ تراش کر اس نے پہلے "ڈا" بنایا پھر "دا"۔ کوں (کو) گر (گا) اور نوں (نا) خاص اردو کے ہیں جو نے انہیں اردو سے لیا۔ اخذ و استفادہ کی یہ چند مثالیں وضاحت کے لئے ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر اس کا ثبوت پیش نہیں کیا کہ یہ اردو والے پنجابی اور برج میں اردو سے گئے۔ اس قسم کے در آمد کئے ہوئے الفاظ و کلمات نیز لاحقوں سے زبان کا آغاز اور اس کا ماخذ متعین کرنے میں کوئی روشنی نہیں ملتی۔ زیادہ سے زیادہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فلاں زبان نے فلاں زبان سے استفادہ کیا۔ چراغ سے چراغ جلایا گیا تا کہ کر مجلس سجائی۔ لیکن یہ کوئی انہونی بات نہیں۔ ہمیشہ سے یونہی ہوتا چلا آیا ہے۔ محفلیں اسی طرح روشن ہوتی ہیں۔ زبانوں نے چراغ سے چراغ جلا کر ہی شبستانوں کو منور کیا ہے اُردو نے خصوصیت کے ساتھ اس میں کبھی کوئی شرم نہیں کی۔ جہاں سے اُسے جو کچھ ملا بے تکلف ہاتھ بڑھا کر لے لیا، اس لئے آج اسے یہ طعنہ سننا پڑا کہ اُردو کھچڑی زبان ہے بقول شخصے کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

---

(۳)

مختلف نظریے

اُردو کے آغاز کے سلسلے میں آج تک جو نظریے اہلِ علم نے پیش کئے اُن میں سنجیدہ اور غیر سنجیدہ سبھی قسم کے ہیں ان میں سے ایک نظریہ جسے میں غیر سنجیدہ سمجھتا ہوں یہ ہے کہ اردو کھچڑی ہے۔ چڑیا لائی چانول کا دانہ چڑا لایا مونگ کا دانہ دونوں نے مل کے کھچڑی پکائی۔ عربی فارسی الفاظ مسلمان اپنے ساتھ لائے، ہندوؤں نے ہندی افعال و حروف فراہم کئے، ہندو مسلمان کے میل ملاپ سے اُردو نے مغلوں کے زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے جنم لیا۔ مسلمان اہل علم زیادہ تر اسی خیال کے ہیں۔ مسٹر بریکو فرماتے ہیں ۔

"ہندی مسلمانوں میں ابھی تک یہ خیال عام ہے کہ اردو ان مختلف زبانوں اور بولیوں کے اختلاط و آمیزش کے بعد جو مغلوں کے دربار میں بولی جاتی تھیں، وجود میں آئی[1]"

---

[1] بلیٹن اورینٹل اسکول اف اسٹڈیز لندن ج ۸ صفحہ ۳۷۷۔

میرا تو یہ ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد سمیت مسلمان اہل علم نے اردو کے آغاز کی بابت جو کچھ لکھا ہے مولانا شیرانی نے اپنی کتب میں درج کر دیا ہے۔ میں اس کو دہرا کر طولِ مقال کا مرتکب ہونا نہیں چاہتا۔ ان اقوال کا خلاصہ مولانا صہبائی کے لفظوں میں پیش کیے دیتا ہوں [۱]:-

"فارسی کے بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر لفظوں میں کثرتِ استعمال کے سبب تغیر و تبدل واقع ہوا اور اس غلط ملط سے جو بولی مروج ہوئی اس کا نام اردو ٹھہرا۔"

مولانا شیرانی اگرچہ اردو کو ان مسلمان اہل علم کی طرح فارسی ہندی الفاظ کے غلط ملط کا نتیجہ نہیں سمجھتے لیکن وہ اس سے پوری طرح متفق ہیں کہ اردو کا آغاز اس وقت ہوا جب مسلمان ہندوستان آئے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"میرے خیال میں اس کو ابھی اسی علم سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں [۲]"

مسلمان اہل علم نے اردو کا سنگِ بنیاد عہدِ غوری میں رکھ کر اس کا نشو و نما خلجیوں کے عہد میں دکھایا، اور شاہجہان کے عہد میں پروان چڑھایا۔ مولانا شیرانی پنجاب کو اس کا مولد بتاتے اور غزنویوں کے عہد میں اسے پھولتا پھلتا دکھلاتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ مولانا شیرانی عام مسلمان اہلِ علم کے خلاف اردو کی قدامت کے قائل ہیں وہ اس کے آغاز کو مغلوں یا خلجیوں سے پیچھے ہٹا کر غزنویوں کے عہد تک لے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی کوشش رائگاں گئی۔ اردو وہیں رہی جہاں مسلمان اہل علم نے اسے رکھا تھا اور پنجابی اس سے آگے بڑھ گئی۔ مولانا نے اردو کی قدامت دکھانے کے لئے قلم اٹھایا تھا۔ اردو کی بدقسمتی ہے کہ ان کا قلم اٹھا اور قدیم پنجابی کی قدامت دکھانے

---

۱ بحوالہ پنجاب میں اردو (طبع دوم) صفحہ ۴۸

۲ پنجاب میں اردو مقدمہ صفحہ (الف)

کے خدوخال ابھرنے لگے۔ میں تفصیل کے ساتھ اوپر بیان کر چکا ہوں کہ اردو آج کی زبان ہے۔ اس کی اپنی شخصیت ہے جو اسے اس پاس کی چھوٹی بڑی بولیوں سے ممتاز بناتی ہے۔ سوال اس زبان کا ہے کہ یہ کب وجود میں آئی۔ اس کے خط و خال کب ابھرے کہ وہ اپنے پڑوس کی بولیوں سے ممتاز اور مختلف زبان بنی؟ مولانا شیرانی کے بقول "اردو اگر اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنی تو وہ بارھویں صدی عیسوی سے پہلے پنجاب میں کہاں پہنچ گئی۔[1] اور اگر "پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی جاتی ہے"[2] تو وہ اردو نہیں پنجابی ہے۔

مولانا شیرانی مرحوم عام مسلمان اہل علم کی طرح اردو کو مسلمانوں کی آمد سے الگ کر کے نہ دیکھ سکے۔ بظاہر اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی اور بڑی وجہ میرے خیال میں اردو کا عربی و فارسی سرمایہ ہے۔ اردو میں ہند و پاکستان کی دوسری بولیوں کے مقابلے میں فارسی عربی الفاظ بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ ان الفاظ کی فراوانی کو دیکھ کر اہل علم نے سمجھا کہ "اردو اسلامی دور میں اسلامی اثرات میں بنی" اور اردو کی ابتدا کا جوڑ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کے قیام و استقلال سے لگانے لگے۔ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ کسی زبان کے لئے دوسری زبانوں سے اخذ و استفادہ عام اور سامنے کی بات ہے۔ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی اور ترقی یافتہ زبان نے فاتح اقوام کی زبان سے استفادہ کیا۔ اس کے الفاظ و کلمات کی آغوش کھول کر پذیرائی کی۔ انگریزی نے فرانسیسی کی وساطت سے نہ صرف الفاظ، سابقے اور لاحقے، جمع کے قاعدے، تذکیر و تانیث کے اصول بڑی بے تکلفی سے قبول کئے جو آج انگریزی کے مزاج میں دخیل ہیں۔ اردو نے عربی و فارسی عناصر کے ساتھ اتنی بے تکلفی نہیں برتی اور نہ یہ عناصر اردو کی فطرت میں جذب ہو سکے۔ اس کے باوجود اردو کو اردو والوں نے مسلمانوں کی ساختہ و پرداختہ

---

١ پنجاب میں اردو مقدمہ صفحہ ٣

٢ پنجاب میں اردو مقدمہ صفحہ ٤

زبان بنایا۔ انگریزی والوں میں سے کسی نے بھی موجودہ انگریزی کی پیدائش کو نارمن فتوحات کا نتیجہ قرار نہیں دیا۔ ہمارے اہلِ علم نے اس پر غور کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس میں شک نہیں اردو نے فارسی وعربی الفاظ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیے جو بعد میں کے اردو ہو گئے لیکن اردو کا مزاج بدستور ہندآریائی رہا۔ فارسی وعربی کا اس پر کوئی بہت گہرا اثر نہیں پڑا۔ فارسی وعربی اثرات جنہیں اسلامی اثرات کا نام دیا جاتا ہے اور جن کی بنا پر اردو کی ابتدا مسلمانوں کی فتوحاتِ ہند سے بتائی جاتی ہے یہ ہیں:۔

(۱) فارسی وعربی کے مفرد الفاظ جنہیں ہم دخیل کہتے ہیں۔ جیسے کتاب۔ خط پیام وغیرہ

(۲) یائے نسبت۔ جیسے کبابی۔ دہلوی وغیرہ۔

(۳) اضافت جیسے آب جو۔ دانہ الائچی۔

(۴) فارسی وعربی جمع کے قاعدے۔ جیسے۔ کتب۔ مجالس۔ بندگانِ خدا وغیرہ

(۵) کہ بیانیہ۔ واو عطف اور چند سابقے: بے۔ بد وغیرہ

(۶) فارسی وعربی مرکبات۔ خوش بو۔ بین السطور۔ مابین۔ درمیان۔

ان میں سے مفرد الفاظ اور مرکبات کا تعلق فرہنگ سے ہے اور میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ زبان کی فرہنگ میں ضروری نہیں کہ تمام الفاظ اس زبان کی پیداوار ہوں۔ وہ دوسری زبان سے بھی لیے جا سکتے ہیں ان کی وجہ سے زبان کے مزاج، اس کی فطرت اور شخصیت پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ یائے نسبت اور اضافت یا جمع کے طریقے زبان کا جزو ہیں۔ اس لیے اس کی فطرت میں داخل ہیں۔ لیکن معیاری اردو میں ابھی تک نسبت، اضافت اور عربی و فارسی جمع کے طریقے دیسی یعنی ہندی الاصل الفاظ تک رسائی حاصل نہیں کر سکے۔ ہندی لفظ کی طرف ہندی، فارسی، یا عربی لفظ

کی اضافت یا ہندی لفظ کے آخر میں یائے نسبت کا الحاق، یا عربی و فارسی قاعدے سے اس کی جمع ان میں سے کسی چیز کو بھی آج صحیح نہیں سمجھا جاتا افسوس قسم کی ترکیب اسلاف میں سے اگر کسی نے استعمال کی ہے تو اسے "گنگا جمنی" کہہ کر مضحکہ اڑایا جاتا ہے مثلاً ولی کا شعر ہے:-

آ اے صنم شتاب کہ روزِ نہان ہے گنگا رواں کیا ہے اَپس کے نین سیتی

سودا کہتے ہیں:-

پوشش چھینٹ قلمکار بہر دشت و جبل بخشی ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی

میرزا مظہر جانجاناں کے مندرجہ ذیل شعر میں ہندی لفظ کی اضافت ہندی لفظ کی طرف کی گئی ہے۔

کسی کے خون کا پیاسا کسی کی جان کا دشمن نہایت منہ لگایا ہے جن میں بیڑیاں کو

مقام کی طرف نسبت کر کے مقامی کہہ سکتے ہیں لیکن جگہ کی طرف نسبت کر کے جگہی کہنا غلط ہے۔ آب جو صحیح ہے۔ آب گر غلط غلط۔ قاعدہ کی جمع قواعد درست ہے لیکن اس کے قیاس پر لوٹے کی جمع لواٹی درست نہیں۔ واؤ عطف کا حال بھی یہی ہے اس کے ذریعے دو فارسی لفظ یا ایک فارسی اور ایک عربی یا عربی الفاظ جوڑے جا سکتے ہیں ہندی انگریزی، ہندی فارسی، یا عربی انگریزی لفظوں کے درمیان جو آج اردو میں مستعمل ہیں، واؤ عطف لانا غیر فصیح ہی نہیں نا صحیح بھی ہے، اسے دیکھ کر اہلِ زبان ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ فارسی لاحقے اگرچہ آہستہ آہستہ زبان کے مزاج میں درک حاصل کرتے جا رہے ہیں اور ادھر کوئی ساٹھ ستر سال سے بے دھڑک، بے لاگ، بے ڈھب قسم کی ترکیبیں جن میں سابقہ فارسی ہے اور لفظ ہندی، عوام کے دربار میں قبول عام پا رہی ہیں لیکن فصحا بدستور انہیں ٹکسال باہر سمجھتے اور تا بمقدور ان کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔

اردو کا سرمایہ جس کا ذکر میں نے مقالے کی تمہیدی سطور میں کیا آپ کے سامنے

ہے۔ اس میں سے کون سی چیز ہے جسے مسلمانوں نے وضع کیا۔ جس سے اردو کا خمیر بنا اور اس کا کالبد تیار ہوا؟

اس غلط فہمی کی دوسری وجہ مسلمانوں کا وہ سرپرستانہ اور مربیانہ سلوک ہے جو اُنہوں نے اردو کے ساتھ روا رکھا۔ اردو مسلمانوں کے فتح دہلی سے پہلے دہلی اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی اور برج یا اودھی کے مقابلے میں گری پڑی پسماندہ اور برخاک افتادہ زبان سمجھی جاتی تھی۔ مسلمانوں نے اٹھا کر اسے سینے سے لگایا اور نوک پلک سے درست کر کے اس قابل بنا یا کہ اس کے ذریعے شاعرانہ خیالات کا اظہار ہو سکے۔ اس میں علمی اور فنی کتابیں لکھی جا سکیں۔ مسلمان جہاں گئے اُردو ان کے ہمرکاب رہی۔ مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ اردو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی اور مقامی بولیوں کو پیچھے ڈھکیل کر اس نے مسلمانی قلمرو کی وسعت کے مطابق بہت جلد ایک عام اور ملک گیر زبان کا مقام حاصل کر لیا۔ شاید اس سرپرستی اور تربیت کی بنا پر اُردو کو مسلمانوں کی وضع کردہ زبان سمجھ لیا گیا۔ اُردو کا نشوونما مسلمانوں کی سرپرستی اور ان کے سیاسی اقتدار کے زیر سایہ ہوا۔ لیکن زبان خود مسلمانوں کی دہلی میں آمد سے پہلے دہلی میں موجود تھی اور بازار ہاٹ میں بولی جاتی تھی۔ اس کے ارتقا کو ابتدا سمجھ کر اُردو کو مسلمانوں کی ساختہ زبان قرار دے دیا گیا۔ میرے خیال میں ان دو وجوہ کے سوا کوئی تاریخی یا لسانی توجیہ اس بے بنیاد خیال کی پیش نہیں کی جا سکتی۔

مولانا شیرانی مرحوم کے نظریے پر کہ "اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ پنجاب سے دہلی جاتی ہے"۔ تفصیلی بحث اس مقام پر کریں گا جہاں اردو کی ابتدا سے متعلق سوچے سمجھے اور سنجیدہ نظریوں کا ذکر ہوگا۔ یہاں مولانا کے نظریۂ ہجرتِ اردو کے تاریخی پہلو کی بابت یہ واضح کر دوں کہ اس کا منشا درحقیقت یہ خیال ہے کہ اردو مسلمانوں کی سندھ و پاکستان میں آمد سے پہلے کوئی زبان نہ تھی۔ وہ مسلمانوں کے اثر سے

وجود میں آئی۔ عام مسلمان اہلِ علم نے اردو کی ابتدا شاہ جہانی عہد میں کی۔ باری ضرورت سے بتائی تھی۔ مولانا شیرانی نے اس کو ساقط ٹھہرا کر لکھا[1]۔ "اکبر اور شاہ جہاں سے پیشتر ہندو اور مسلمان نہ تھے۔ یا لوگ سودا سلف نہیں لیتے تھے یا مختلف قومیں ایک جگہ رہ کر کاروبار کرنا نہیں جانتی تھیں۔ پھر اکبر یا شاہ جہاں کے عہد کے ساتھ کیا خصوصیت ہے کہ اردو کی بنیاد رکھی جائے"۔ انہوں نے مسلمان اہلِ علم کے اس خیال سے اتفاق کیا کہ اردو مسلمانوں کے اثر سے بنی۔ مسلمان شاہ جہاں اور اکبر سے پہلے ہندوستان پہنچ چکے تھے۔ اکبر یا شاہجہاں کے عہد میں کس لیے اردو کی بنیاد رکھی جائے غزنویوں کے زمانے سے اردو کا آغاز کیوں نہ ہو۔ چنانچہ انھوں نے عام مسلمان اہلِ علم کی رائے میں ترمیم کر کے کہا[2]:

"اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر توطن اختیار کیا"۔ مسلمان اول اول پنجاب گئے تھے اور وہاں کم و بیش ایک سو ستر سال حکمرانی کرنے کے بعد انہوں نے دہلی کا رخ کیا۔ اردو اگر مسلمانوں کے اثر سے بنی تو پنجاب میں بنی جہاں وہ ڈیڑھ سو سال سے رہتے چلے آتے تھے لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ پنجاب کی زبان آج اردو نہیں پنجابی ہے۔ اس کا حل مولانا نے یہ نکالا کہ غزنویوں کے عہد میں اردو پنجابی سے مختلف زبان نہ تھی۔ وہ پنجابی تھی۔ مسلمان اس زبان کو ساتھ لے کر دہلی گئے۔ وہاں برج کے اثر سے کچھ تبدیلیاں ہوئیں تو موجودہ اردو کا خاکہ تیار ہوا اور اس نے وہ شکل اختیار کی جو آج اسے پنجابی سے امتیاز بخشتی ہے۔ اس پورے استدلال کی اساس جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ خیال ہے کہ اردو مسلمانوں کے اثر سے وجود میں آئی۔ اوپر کی سطروں میں اس کی حقیقت واضح کر چکا ہوں یہ سمجھ میں نہیں آیا

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۱۰،

[2] پنجاب میں اردو صفحہ ۷۴

ہوا کہ آخر اردو کی ابتدا کا مسلمانوں سے یا سرزمین ہند میں ان کے سیاسی اقتدار کے قیام و تحکم سے کیا تعلق ہے اور کون سی چیز ہے جو اس امر پر مجبور کرتی ہے کہ ہم اردو کو ہجرت کرا کے دہلی لے جائیں۔ تاریخ ہمیں صرف اتنا بتاتی ہے کہ مسلمان دہلی فتح کرنے سے پہلے کم و بیش ایک سو ستر سال پنجاب میں رہے بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں دہلی فتح ہونے پر وہ دہلی چلے آئے جو مسلمان پنجاب میں ڈیڑھ سو سال سے آباد تھے انہوں نے پنجاب کی زبان سیکھی وہ اسے بولتے ہوئے دہلی پہنچے۔ یہ تاریخ نہیں قیاس ہے۔ فوج میں عام طور سے اٹھارہ سے بیس سال تک کے نوجوان بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ نوجوان پنجاب میں پیدا ہوئے ولایت زاد نہ تھے یا پنجاب میں عرصے سے آباد تھے نو وارد نہ تھے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ دہلی جانے والے نوجوان عرصے سے پنجاب میں آباد تھے اور انہوں نے اس درمیان میں پنجاب کی زبان اچھی طرح سیکھ لی تھی تب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس زبان نے جو مسلمان پنجاب سے سیکھ کر گئے کسی قدر تغیر و اصلاح کے بعد اردو کی شکل اختیار کی یہ اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ دہلی میں اس وقت کوئی زبان رائج نہ ہوتی جسے وہاں کے باشندے (جن کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہوگی) عام طور سے بولتے ہوں یہ تاریخ اور اصول لسانیات، دونوں کے خلاف ہے دہلی میں اس وقت پنجابی اور برج دونوں سے الگ ایک زبان بولی جاتی تھی اور جیسا کہ خود مولانا شیرانی نے لکھا ہے امیر خسرو، ابوالفضل اور شیخ باجن اس زبان کو دہلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں ؟

اس کے علاوہ اگر یہ صحیح ہے کہ اردو کی داغ بیل اس دن سے پڑنی شروع ہوئی جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں توطن اختیار کیا تو اردو کا مولد وادی سندھ کو ہونا چاہیئے پنجاب سے کئی سو سال پہلے مسلمانوں نے سندھ فتح کیا۔ دریائے

سندھ کی وادی میں مدتوں خیمہ زن رہے اور اس کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ انہوں نے سندھی زبان سیکھی۔ اصطخری چوتھی صدی کا سیاح ہے اس کا بیان ہے کہ ملتان اور منصورہ کے باشندے فارسی اور سندھی دونوں بولتے ہیں۔ اردو پنجابی کی شکل میں دہلی جا سکتی تھی۔ سندھی ملتان اور لاہور ہوتے ہوئے دہلی کیوں نہیں جا سکتی؟ مولانا شیرانی فرماتے ہیں جب مسلمان سندھ اور پنجاب پر قابض ہو گئے تو سندھ میں نہیں تو پنجاب میں انہیں کوئی نہ کوئی زبان اختیار کرنی پڑی ہے۔ مولانا سید سلیمان مرحوم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے سندھ میں وہاں کی بول چال کی زبان سندھی اختیار کی۔ مولانا شیرانی کے اصول کے مطابق مولانا سید سلیمان کا فرمانا بے جا نظر نہیں آتا۔ مسلمان پنجاب سے پہلے سندھ پر قابض ہوتے۔ اصطخری کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ملتان اور منصورہ میں سندھی بولی جاتی ہے۔ ہر چند سندھی اور اردو میں مشابہت اس درجے کی نہیں جس درجے کی اردو اور پنجابی میں ہے لیکن مولانا شیرانی کے طریق استدلال کو مثال بنا کر کہا جا سکتا ہے کہ سندھی نے اول اول پنجابی کا روپ اختیار کیا اور آخر آخر وہ اردو کی شکل میں جلوہ گر ہوئی۔ اردو کو سندھ سے نکلے یا سندھی سے بچھڑے بہت زیادہ عرصہ ہوا۔ سندھ سے نکل کر دہلی تک پہنچتے پہنچتے اسے طویل مسافت بھی طے کرنی پڑی اس لئے اردو اور سندھی کی لسانی مشابہتیں پنجابی کے مقابلے میں کم ہیں۔

دو یا دو سے زیادہ زبانوں کی قرابت داری کا فیصلہ ان کے سرمایہ کو دیکھ کر اور ان کے گہرے تقابلی مطالعے کے بعد کیا جاتا ہے لسانی دلائل کی تائید میں تاریخی شہادت پیش کی جا سکتی ہے لیکن یہ شہادت تائیدی ہوگی —— اعتماد صرف لسانی شہادت پر کیا جائے گا۔ مولانا شیرانی نے ترتیب عمل کر تاریخ کو اساس قرار دیا اور اس کی حمایت میں لسانی دلائل پیش کر دیئے یہ طریقہ اصول لسانیات کے خلاف تھا۔ اسے بہت کم ہر شخص غلط سے غلط نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ چنانچہ اول اول میرامّن، سر سید احمد خاں، مولانا صہبائی، مولانا آزاد وغیرہ

علماء نے اس استدلال سے کام لے کر اُردو کا آغاز شاہ جہاں اور اکبر کے عہد میں بتایا اور آخر آخر مولانا سید سلیمان ندوی نے تجویز پیش کی کہ اس کی ولادت سندھ میں مانی جائے۔ یہ تاریخ اور لسانیات کی ترتیب بدلنے اور ان میں الٹ پلٹ کر دینے کی وجہ سے ہوا۔ تاریخ لسانیات کا ماخذ نہیں لسانیات تاریخ کا ماخذ ہے، علماء تاریخ نے تاریخی واقعات اور نتائج لسانیات سے اخذ کئے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ لسانی فیصلے تاریخ کی مدد سے کئے گئے ہوں۔

ڈاکٹر ہیورنلے نے جو ہند آریائی زبانوں کے بہت بڑے ماہر ہیں، اردو کو ایک طرح کی مخلوط زبان بتایا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:[۱]

"اردو مقابلۃً حال کی پیداوار ہے۔ دہلی کے نواح میں، جو مسلم اقتدار کا مرکز تھا اردو بارھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی۔ یہ علاقہ برج، مارواڑی، پنجابی کے سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقامی باشندوں اور مسلمان سپاہیوں کے اختلاط و ارتباط سے ایک ملی جلی زبان وجود میں آئی جو صرفی نحوی اصول کی حد تک برج ہے اگرچہ اس میں پنجابی اور مارواڑی کی آمیزش بھی ہے اس کے کچھ الفاظ دیسی ہندی ہیں اور کچھ بدیسی یعنی فارسی و عربی۔"

ڈاکٹر گریرسن نے ۱۸۸۰ء میں ڈاکٹر ہیورنلے اور مسلمان اہل علم سے متاثر ہو کر اردو کو ملی جلی زبان بتایا ہے۔[۲]

"اردو قواعد اور فرہنگ الفاظ کے لحاظ سے مخلوط، عام اور مشترک زبان ہے اس میں شمالی ہندوستان کی مقامی بولیوں کے علاوہ عربی فارسی، ترکی، تیلگو زبان کے الفاظ شامل ہیں۔ اس کے صرفی نحوی قواعد نے شمالی ہند کی علم بولیوں

---

[۱] گوڈی زبانوں کی گرامر مقدمہ صفحات ۶، ۷

[۲] کلکتہ ریویو ۳۱ء صفحہ ۱۵۶

سے خوشہ چینی کی ہے اس لئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ کسی ایک مخصوص اور معین زبان سے ترقی پا کر بنی ہے۔"

لیکن ۱۹۰۰ء کے قریب ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ لیتے وقت انہوں نے اس خیال سے رجوع کر لیا اور اردو کو بالائی دوآبے اور مغربی روہیل کھنڈ کی ہندوستانی پر مبنی قرار دیتے ہوئے لکھا:

"ہندوستانی کے آغاز کے بارے میں آج تک اہل علم نے (جن میں میں خود بھی شامل ہوں) جو کچھ لکھا ہے، میر امن کے دیباچہ باغ و بہار سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ میر امن کے بیان کے مطابق اردو ان مختلف لوگوں کی بولیوں کی معجون مرکب ہے جو دہلی کے بازار میں جمع ہو گئے تھے۔ اس غلط فہمی کو اول اول سر جان بیمس لایل نے ۱۸۸۰ء میں دور کیا۔ ہندوستانی زبانوں کے تفصیلی جائزے نے اب اس کو ثابت کر دیا ہے۔ کہ ہندوستانی (اردو) بالائی دوآبے اور مغربی روہیل کھنڈ کی (بول چال کی) زبان ہے۔ ان گھڑ اور گنوارو الفاظ و محاورات نکال کر جسے ادبی نکھار سنگھار دے دیا گیا ہے۔[1]"

۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۹ء کے درمیان انہوں نے بالائی دوآبے کی وضاحت ان الفاظ میں کی:-

"ہندوستانی مغربی ہندی کی وہ شاخ ہے جس کا وطن بالائی دوآبہ گنگ ہے جو میرٹھ کے گرد و نواح میں واقع ہے۔[2]"

اس کے باوجود اب تک ہندی اور مغربی اہل علم کی خاصی بڑی تعداد اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اردو مختلف بولیوں اور زبانوں کا ملغوبہ ہے مسٹر بارنیکوف لکھتے ہیں۔[3]

---

[1] "ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ" ج ۹ حصہ اول حاشیہ صفحہ ۴۴
[2] امپیریل گزیٹیر (ایڈیشن ۱۹۰۷ء) صفحہ ۳۶۵
[3] بلیٹن آف دی اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۸ صفحہ ۳۷۷

"میر امّن نے اردو کے آغاز سے متعلق جس خیال کا اظہار کیا تھا اسے متعدد مغربی علما نے قبول کر لیا، جن میں سے کچھ آج بھی اردو کو ایک طرح کی بناوٹی زبان مختلف بولیوں اور زبانوں کا مرکب سمجھتے ہیں۔"

ہورنلے کی رائے مسلمان اہلِ علم کی رائے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ مسلمان عالموں کی طرح وہ اردو کو مسلمانوں کی ساختہ پرداختہ زبان نہیں بتلاتے۔ مسلمان سپاہیوں اور مقامی ہندو باشندوں کے اختلاط اور ملاپ کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پنجابی، مارواڑی عناصر کی آمیزش کے بعد برج بھاشا نے اردو کا روپ اختیار کیا۔ برج، پنجابی، مارواڑی کے اختلاط و ترکیب کے بعد اردو وجود میں آئی۔ گریرسن نے اردو کے صرفی، نحوی سرمایے کو مساوی طور سے ان زبانوں سے ماخوذ بتایا تھا۔ ہورنلے نے اس میں یہ ترمیم کی کہ پنجابی مارواڑی سرمایہ اردو میں برجی سرمایہ کے مقابلے میں کم ہے۔ اس نظریے کو بھی میں غیر سنجیدہ سمجھتا ہوں۔ ایک طرح سے یہ بھی اردو کو کھچڑی زبان قرار دیتا ہے۔ سنجیدہ نظریے دو ہیں۔ اردو برج سے ماخوذ ہے۔ اسے اردو میں سب سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے پیش کیا۔ اردو اصلاً پنجابی ہے اس کا بڑا اور اہم سرمایہ پنجابی سے لیا گیا۔ یہ مولانا حافظ محمود خاں شیرانی کا نظریہ ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے پنجابی اردو کی لسانی مشابہتیں دکھا کر یہ نتیجہ نکالا کہ اردو پنجابی سے ترقی پاکر وجود میں آئی۔ برج کے اثرات نے اسے ایک مستقل اور آزاد زبان کی حیثیت دی۔ غیر سنجیدہ نظریوں میں سے دوسرا نظریہ جسے ہورنلے نے پیش کیا پہلے اور تیسرے نظریہ کی آمیزش کا نتیجہ تھا۔ دوسرا سنجیدہ نظریہ تیسرے اور چوتھے نظریے کا مرکب ہے ان سب کی بنیاد آمیزش پر ہے۔ پہلے نظریے کی رو سے اردو اصلاً کوئی ایک زبان نہیں، مساوی طور سے کئی زبانوں کا مرکب ہے دوسرے اور تیسرے نظریوں نے اسے اصلاً برج قرار دیا۔ چوتھے نظریے نے اصلاً پنجابی بتایا اور پھر اس پر برج کی تہیں چڑھائیں۔ ڈاکٹر گریرسن پہلی مولانا شیرانی کے ہم نوا

ہیں۔ وہ فرماتے ہیں [1]

"اُردو ۱۰۲۰ء کے لگ بھگ لاہور میں پیدا ہوئی۔ قدیم پنجابی اس کی اصل ہے۔ اور قدیم کھڑی بولی مانند سوتیلی ماں، جس سے براہ راست اس کا کوئی رشتہ نہیں۔۔۔ مسلمان سپاہیوں نے پنجابی کے اس روپ کو جو ان دنوں دہلی کی قدیم کھڑی بولی سے زیادہ مختلف نہ تھا اختیار کیا اور اس میں فارسی الفاظ اور فقرے شامل کر دیئے"

مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر چٹرجی اور ڈاکٹر گریرسن اُردو کی تعمیر میں پنجابی کا ایک بڑا حصہ بتلاتے ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور مولانا شیرانی سے پوری طرح متفق ہیں۔ وہ اردو کی پیدائش پنجاب میں مان کر کہتے ہیں کہ اُردو نے پنجاب سے ہجرت کی تو اس کی منزل دہلی ہوئی۔ دہلی سے اس نے دکن و گجرات کا رُخ کیا۔ ان نظریوں کا ماحصل مختصر الفاظ میں پیش کرنے کے بعد ان پر بحث کرنا مناسب ہوگا۔

(۱) اردو مسلمانوں کی آمد سے پہلے کوئی زبان نہ تھی۔ دہلی اور اس کے نواح میں پنجابی برج، مارواڑی وغیرہ زبانوں کے اختلاط و ارتباط سے اردو وجود میں آئی۔

(۲) پنجابی، مارواڑی عناصر قبول کرنے کے بعد برج بھاشا نے جو روپ اختیار کیا اس کا نام اردو ہے۔ اردو برج بھاشا سے ماخوذ ہے۔

(۳) اردو اصلاً پنجابی ہے جس نے دہلی پہنچ کر برج اور مارواڑی اثرات میں اردو کی شکل اختیار کی۔ یعنی اردو پنجابی سے ماخوذ ہے۔

میں نے اوپر تمہیدی سطور میں عرض کر دیا تھا کہ کوئی زبان دو یا دو سے زیادہ زبانوں سے مل کر کبھی اس طرح وجود میں نہیں آتی کہ اصل و اساس کے لحاظ سے وہ دونوں میں سے ایک زبان نہ ہو دونوں کا مجموعہ ہو کچھ بنیادی عناصر اس نے ایک زبان سے لئے ہوں اور کچھ دوسری سے اور یہ مشترک عناصر یکساں اور مساوی دیکھے جا سکتے ہوں تو ان کے

[1] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء صفحہ ۲۹۱

دونوں پلڑے برابر ہوں۔ یہ قیاسِ صحیح کے خلاف ہے۔ زبانوں اور بولیوں کی تاریخ اس کی تردید کرتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی ڈیڑھ سو سے اوپر بولیوں میں سے جو اس کے طول و عرض میں رائج ہیں کوئی بولی بھی مخلوط نہیں۔ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے ملاپ سے کبھی کوئی تیسری زبان وجود میں نہیں آئی کہ وہ اصلاً ان سے جدا ہو۔ زبان زبان سے استفادہ کرتی ہے۔ کچھ دیتی ہے کچھ لیتی ہے۔ یہ لین دین عموماً فرعی یعنی غیر اساسی ہوتا ہے۔ دوسری زبان سے استفادہ کرنے کے بعد زبان کی فطرت نہیں بدلتی روپ بدل جاتا ہے مزاج میں تغیر نہیں ہوتا رنگ نکھر جاتا ہے۔ اردو ہی کی مثال لیجیے۔ اردو نے فارسی سے کتنا کچھ فیض اٹھایا اور اس کی وساطت سے عربی ترکی سے بھی استفادہ کیا۔ اس تمام سرمایہ کا، جو اردو نے فارسی، عربی، ترکی سے لیا۔ اختصار کے ساتھ اوپر ذکر کر چکا ہوں اور لسانی تجزیہ کر کے بتا چکا ہوں۔ کہ اردو کا یہ حاصل کردہ سرمایہ تمام تر غیر بنیادی ہے اردو نے اسے اپنانے کے بعد بھی اس کا پرچھاواں اپنی فطرت، مزاج اور منہاج پر نہیں پڑنے دیا۔ وہ بدستور اردو کے ذاتی سرمایہ سے اچھوتوں کی طرح الگ تھلگ رہا۔ اس سے تال میل نہ رکھ سکا۔ جب اردو کے اس سرمایہ کی یہ کیفیت ہے کہ وہ تقریباً سات سو سال گھلنے کے بعد بھی اردو کے مزاج میں دخل نہ پا سکا اور اس سے دور دور رہا تو ہم یہ کیسے باور کر لیں کہ اس زمانے کے لگ بھگ پنجابی، برج، مارواڑی، گجراتی عناصر نے گھل مل کر نئے مزاج نئی فطرت، نئی روح اور نئے رجحان کی زبان کا ڈول ڈالا۔ مختلف عناصر ایک قالب میں ڈھل گئے اور گھل مل کر ایک نئی زبان بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

زبانوں کا تال میل نہیں ہوتا جب تک بولنے والوں کا میل ملاپ نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ شمالی ہند کی جن زبانوں کے تال میل سے اردو وجود میں آئی ان کے بولنے والوں کا ملاپ کہاں اور کیسے ہوا؟ ڈاکٹر مسعود نے دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقے کو پنجابی، برج، مارواڑی کا سنگم بتلاتے ہیں۔ اردو کی تخلیق میں زیادہ سے زیادہ ان تین زبانوں کا حصہ ہو سکتا

ہے۔ شمالی ہند کی دوسری زبانوں مثلاً نیپالی، گجراتی، سندھی نے برج کے علاقے دہلی اور میرٹھ سے دور رہ کر اردو کی تعمیر میں کیونکر شرکت کی اس کی مہر پر غلاؤ کے علاقے تک کیسے پہنچیں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ نہ قیاس سے اس کی تائید ہوتی ہے نہ تاریخ سے۔ اردو کے لسانی سرمایہ کو جو اردو اور شمالی ہند کے بعض زبانوں میں مشترک ہے سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کر دیا گیا۔ لسانیات کے لئے تاریخ کی تائید ضروری ہے اور جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا لسانیات کے وہ فیصلے جن کی توثیق تاریخ سے نہ ہو اس قابل نہیں کہ انہیں قبول کیا جائے۔

پنجابی، برج اور مارواڑی کا میل ملاپ تاریخی طور پر ممکن ہے لیکن دہلی اور اس کے نواح میں جو ان تین زبانوں کا کبھی سنگم تھا ان کا میل ملاپ زندہ اور بولی جانے والی زبانوں کی حیثیت میں ہوا ہوگا یہ زبانیں اس علاقے کی بولیاں ہوں گی۔ کچھ لوگ مثلاً پنجابی بولتے ہوں گے اور کچھ برج یا مارواڑی بدقی یہ زبانیں اس علاقے میں بولی جاتی رہی ہوں گی اس کے بعد لسعد اس طرح بنی ہو گی کہ کچھ پنجابی اور مارواڑی عناصر برج میں آ گئے ہوں گے یا اس کے برعکس برجی اور مارواڑی عناصر پنجابی میں دخل پا گئے ہوں گے۔ اختلاط کی صاف اور سیدھی صورت یہی ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کہ اس اختلاط وارتباط کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ یہ لسانیات کے مسلم اصول کے خلاف بھی ہے۔ ماہرین لسانیات نے باتفاق اس امر کی تصریح کی ہے، جیساکہ ڈاکٹر ٹی۔ جی نکر کا بیان ہے ؎ کہ زبان دوسری زبان کے الفاظ جتنے چاہے مستعار لے کر اپنا لے۔ ایک زندہ اور بولی جانے والی زبان غیر زبان کے صرفی نحوی قاعدے اور تعمیری اصول کبھی نہیں اپناتی۔ یہ زبان کی فطرت اور اس کے مزاج کے خلاف ہے زبانوں کی تاریخ اسے جھٹلاتی ہے۔ فارسی نے عربی سے استفادہ کیا۔ بے شمار عربی الفاظ اور مرکبات لے کر اپنا لئے لیکن عربی کے صرفی نحوی قاعدے اس کے لئے ویسے ہی اجنبی رہے۔ ڈاکٹر نکر فرماتے ہیں، فارسی نے عربی قواعد کے ذخیرے سے حرف علامت جمع

؎ زبان کی فطری تاریخ صفحہ ۱۰۳

"ات" بھی تھی جو فارسی میں جڑ نہ پکڑ سکی۔ فارسی عربی الاصل الفاظ کی جمع "ات" کے اضافے سے بنتی ہے۔ فارسی الفاظ کی جمع جب قاعدہ فارسی غلطی ہے مگر گزارشات۔ فرمائشات وغیرہ جیسے الفاظ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ فارسی میں علم نہیں۔ انگریزی نے بھی لاطینی سے جمع کے بعض لاحقے مستعار لئے تھے یہ لاطینی الفاظ تک محدود ہے۔

اس کے علاوہ اردو اگر پنجابی، برج، اور مارواڑی کے اختلاط سے بنی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو 'تیرا' (ضمیر مضاف اضافی) کا 'ت' برج سے آیا۔ 'ر' مارواڑی سے لی گئی اور 'ا' پنجابی سے۔ یا "توکرتا ہے" کا 'تو' 'ت' اردو سے برج کے ہیں اور 'ا' پنجابی کا یہ دو مثالیں ہیں۔ اردو کے باقی سرمائے کو اس پر قیاس کر لیا جائے۔ کیا کوئی صاحب ہوش اس کو صحیح سمجھ سکتا ہے۔ صرفی، نحوی قاعدوں اور لاحقوں، سابقوں کا اخذ و استفادہ خلافِ عادت و فطرت تھا۔ ان کا تجربہ کر کے ان کے کسی ایک جزو کا ایک زبان سے لینا اور دوسرے جزو کا دوسری زبان سے، زبان کے مزاج، بنیاد، تعمیرِ و تشکیل کی رسم و راہ کو دیکھتے ہوئے ناممکن نظر آتا ہے۔

شمالی ہند کی جدید آریائی زبانوں کا صرفی نحوی سرمایہ بڑی حد تک مشترک ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان زبانوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا اور یہ سرمایہ ایک سے دوسرے کے پاس، دوسرے سے تیسرے کے پاس منتقل ہوتا چلا گیا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبانیں متحد الماخذ یا قریب الماخذ ہیں۔ کسی قدیم زمانے میں یہ ایک زبان سے متفرع ہوئیں یا ایک جیسی کئی زبانوں سے نکل کر یہ ملک میں پھیلیں۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ ترقی کرنے کے مواقع ملے۔ اس لئے ان کا اختلاف جو شروع میں کچھ زیادہ نہ تھا بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مختلف آزاد زبانیں بن گئیں۔ ان زبانوں نے کچھ سابقے، لاحقے یا صیغے پاس پڑوس کی زبانوں سے بھی لئے لیکن جیسا میں نے عرض کیا، یہ کلمے زبان کی فطرت میں جڑ نہ پکڑ سکے۔ کچھ زمانے وہ اصل کلمات کے پہلو بہ پہلو استعمال ہوتے

سے ہے۔ اس کے بعد انہیں دس نکالا مل گیا۔ اس کی مثالیں میں اوپر کہیں درج کر آیا ہوں۔ فعل حالیہ کرسے ہے، پڑھے ہے۔ اردو میں برج سے آیا۔ کرتا ہے، پڑھتا ہے اردو ہے۔ برج نے اس سے کرت ہے۔ "پڑھت ہے" یا "کرتو ہے" "پڑھتو ہے" بنلیا۔

اردو کی طرح اور بھی کئی زبانیں ہیں جو دو زبانوں کے مابین واقع ہونے کی وجہ سے بین بین حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں کچھ خصوصیات ایک زبان کی ہیں اور کچھ دوسری کی۔ ان مشترک خصوصیات کی وجہ سے ان زبانوں کو مخلوط اور دونوں طرف کی زبانوں سے مرکب قرار نہیں دیا گیا۔ اودھی زبانوں کے مشرقی گروہ اور مغربی گروہ کے درمیان واقع ہے۔ مغربی گروہ کی زبانوں کی طرح ماضی مطلق وہ "ے۔ ا" یا "ے۔ ۂ" سے مشتق ہے اور مشرق کی زبانوں کی طرح فعل مستقبل "ب" کے اضافے سے۔ اردو پر قیاس کر کے کہا جاسکتا ہے کہ اودھی مخلوط زبان ہے۔ اس کی گرامر نے مشرق و مغرب کی زبانوں سے خوشہ چینی کی۔ وہ کسی مخصوص زبان سے ترقی پاکر نہیں بنی۔ اودھی اور اردو میں اس لحاظ سے کیا فرق ہے اور کس لیے محض اُردو کو مخلوط زبان بتایا جاتا ہے۔

اردو برج سے ماخوذ ہے۔ یہ نظریہ سب سے پہلے ڈاکٹر ہیورنلے نے پیش کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اس کی نشر و اشاعت کی۔ مولانا شیرانی مرحوم کی قابل قدر کتاب "پنجاب میں اردو" کی اشاعت سے پہلے یہ نظریہ عام طور سے صحیح سمجھا جاتا تھا اور ہر شخص جسے اردو زبان سے دلچسپی ہے اس پر اعتقاد رکھتا تھا۔ مولانا شیرانی کی کتاب ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی اس میں مفصل طور پر اور بڑے مدلل انداز میں اس نظریے کا رد کر دیا گیا تھا۔ لیکن مولانا آزاد کے قلم کا جادو اور انداز بیان کا اعجاز تھا کہ لوگ اس کے بعد بھی یہی کہتے رہے کہ اردو برج کی بیٹی ہے۔ اس نے برج کے بطن سے جنم لیا۔ ۱۹۲۸ء کے بعد اردو اور ہندی میں چھوٹے بڑے رسالے اور صدارتی خطبے شائع ہوئے جن میں اردو کی ابتدا اور اس کی اصل سے بحث کی گئی تھی۔ مستقل تصانیف میں بھی ضمناً اردو کے آغاز کا ذکر آیا۔ سب نے اُردو

کی اصل برج کو ٹھہرایا۔ رام چندر شکل کے بیان کے مطابق ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر نے ۱۹۲۰ء میں بیابگ ڈتہل اس امر کا اعلان کیا کہ اردو برج کے بطن سے ہے۔ مسلمانوں نے اسے نوک پلک سے درست کیا۔ اردو میں جن بزرگوں نے یہ غلط فہمی پھیلائی ان میں زیادہ تر وہ اہل علم تھے جنہیں زبانوں کے مزاج، ان کے تغیر و تبدل، یا تنوع کی تاریخ میں درک نہ تھا۔ مولانا آزاد کی تقلید میں وہ اردو کا جوڑ برج بھاشا سے لگاتے رہے لیکن جو لوگ اردو اور برج دونوں کے مزاج سے باخبر تھے انہوں نے مولانا شیرانی مرحوم کی کتاب شائع ہونے سے پہلے ہی مولانا آزاد کے اس دعوے کو ماننے سے انکار کر دیا کہ اردو برج کی بیٹی ہے۔ رام بابو سکسینہ کی کتاب "اردو ادب" کی تاریخ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے اردو کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھا[1]

"یہ کہنا بھی کسی قدر غلط ہے جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ اردو براہ راست مغربی ہندی کی شاخ برج بھاشا سے نکلی۔ برج بھاشا اگرچہ اس بولی سے بہت قریب ہے جو دہلی اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی اور بعضوں میں غائت درجے کی مشابہتیں بھی ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ دہلی کی بولی سے مختلف ہے۔ یہ متھرا اور اس کے آس پاس کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ اردو اس کی بہن کھڑی بولی کے بطن سے پیدا ہوئی۔"

گراہم بیلی نے مولانا آزاد کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی سے متاثر ہو کر ہی اس کی تشریح کی تھی۔[2]

"قدیم کھڑی بولی اردو کی سوتیلی ماں ہے۔ اس کا برج سے براہ راست کوئی رشتہ نہیں۔"

یہ عجیب بات ہے کہ اردو کی ابتدا کے بارے میں اردو میں دو نظریے بلند

---

[1] تاریخ ادب اردو (انگریزی) مقدمہ صفحہ ۱۔
[2] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء صفحہ ۲۹۱۔

آہنگی کے ساتھ پیش ہوئے اردو دونوں پنجاب ہے۔ مولانا آزاد نے فرمایا اردو برج سے نکلی ہے اس کے مقابلے میں محمود شیرانی کی آواز آئی اردو پنجابی کی بیٹی ہے۔ آج یہ نظریے طریق تبادل صحیح سمجھے جاتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے۔ سچائی ان دونوں کے درمیان ہے۔ ان میں سے کوئی ایک ضرور صحیح ہے۔ برج یا پنجابی ان میں سے کسی ایک سے ارتقا پاکر اردو بنی ہے۔

آئیے ان نظریوں کا جائزہ لیں اور دیکھیں ان میں سے کونسا صحیح ہے۔ ان کے صرفی، نحوی اور صوتی سرمایہ کے تقابلی مطالعے کے بعد فیصلہ کریں کہ اردو کا ان زبانوں سے کیا رشتہ ہے۔ اس لئے کہ زبانوں کا رشتہ، جیساکہ میں نے عرض کیا ان کے صرفی نحوی قواعد و اصول کے تقابلی مطالعے کے بعد ہی دریافت ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں اردو برج سے بہت قریب ہے۔ یہ قرب اس امر کا ثبوت ہے کہ اردو اور برج اجنبی نہیں ایک دوسرے کی عزیز ہیں۔ دو زبانوں میں قرب جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی قرابت قریب کی ہوگی۔ لیکن قریب کی قرابت ماں بیٹی ہی میں نہیں دو بہنوں میں بھی ہوتی ہے۔ اس لئے دو زبانوں میں بہت زیادہ مشابہتیں دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ماں بیٹیاں ہیں صحیح نہیں۔ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے رشتوں کی ٹھیک تعیین میں مشابہتیں کام نہیں آتیں، وہ سرمایہ کام آتا ہے جو ان زبانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا، اور ان میں اختلاف پیدا کر کے انہیں آزاد اور مستقل زبانیں بناتا ہے۔

حسب ذیل اصول و نکات میں اردو برج بھاشا سے ممتاز اور مختلف ہے۔

(۱) اردو کے جو اسماء، صفات، نیز افعال "ا" پر ختم ہوتے ہیں۔ برج میں ان کی جگہ "و" یا "ے" ہوگا۔ جیسے گھوڑو (گھوڑا)، بڑو (بڑا)، کیو (کیا)

(۲) اردو میں مادے پر "ا" بڑھانے سے ماضی مطلق صیغہ واحد بنتا ہے۔ برج میں "یو" بڑھایا جاتا ہے یعنی آخری حرف "و" اس سے پہلے "ی" ہوتی ہے جیسے مار یو (مارا) بھجو ڑیو (بھیجا) وغیرہ۔

(۳) ماضی مطلق کے حرف "ا" سے پہلے اردو میں فتحہ ہوتا ہے لیکن برج کے "یو" سے پہلے کا حرف ساکن ہوگا جیسے مارا (اردو) ماریو (برج) چلا (اردو) چلیو (برج)۔

(۴) متعدی بنانے کا طریقہ اردو میں برج سے مختلف ہے۔ اردو میں متعدی لازم کے بعد "ا" بڑھا کر بنایا جاتا ہے اور متعدی المتعدی "وا" بڑھا کر۔ برج میں متعدی "ے" لو کے اضافے سے بنتا ہے اور متعدی المتعدی "ے" واؤ کے اضافے سے

(برج)	(اردو)
کراؤناں۔ کرواؤناں	کرانا۔ کروانا
پڑھاؤناں۔ پڑھواؤناں	پڑھانا۔ پڑھوانا
بلاؤناں۔ بلواؤناں	بلانا۔ بلوانا

مادے کے آخر میں حرف علت ہو تو اردو اس کو "ل" سے بدل لے گی۔

کھلانا۔ کھلوانا	(مادہ کھا)	کھواؤناں
دلانا۔ دلوانا	(مادہ دے)	دواؤناں

(۵) اردو کی ضمیر واحد متکلم (بحالت فاعلی) "میں" ہے اور برج کی "ہوں"۔

(۶) اردو کے اسماء مطلقہ (ضمائر، اشارات موصولات) میں غیر فاعلی حالت میں "س" ہوتا ہے۔ جیسے۔ اُس (وہ) اِس (یہ) جس (جو) تس (تو)۔ جمع کی حالت میں یہ "س" "ن" ہو جاتا ہے۔ اُن۔ اِن۔ جن۔ تن۔ برج میں "ہ" بڑھا دی جاتی ہے۔ جیسے۔ جا (واہی) یا (یاہی) جا (جاہی) کا (کاہی)

(۷) برج میں مفعول کی علامت "ہ" یا "ہی" ہے۔ جیسے ھنیّو راوَن شری رام (راون کو رام نے مارا) برج میں مفعولی ضمیروں، اشارات و موصولات کے آخر میں یہ "ہ" موجود ہے۔ جیسے موہی (مجھ کو) توہی (تجھ کو) واہی (اس کو) یہی (اس کو)

(۸) اسماء ضمائر اور افعال میں برج کا رجحان "ـــ" ے، اور "ـــ و" کی طرف ہے۔

اردو کا 'ہے' اور 'ے' 'و' کی طرف کرنے (کریے) کرنو (کرو) کرئیں (کریں) کوں (کو) تمہیں (تمہیں) ہمیں (ہمیں)۔

(۹) اردو 'گا' کی مدد سے فعل مستقبل بناتی ہے اور برج 'ہ' کی مدد سے جیسے۔

	(مفرد)	(جمع)		(مفرد)	(جمع)	
متکلم	کروں گا	کریں گے	اردو	کریَوں	کریَں	برج
حاضر	کرے گا	کرو گے		کرَہے	کرَہو	
غائب	کرے گا	کریں گے		کرَہے	کرَہیں	

(۱۰) برج میں فعل حال کا صیغہ واحد متکلم کروں (بواو مجہول) ہے اور اردو میں کروں (بواو معروف)۔

(۱۱) برج میں جمع کا قاعدہ آسان اور سادہ ہے۔ اسم کے آخر میں 'ن' اضافہ کر لینے سے جمع بن جاتی ہے اردو میں جمع بنانے کا قاعدہ بہت پیچیدہ ہے۔ برج ہاسی برج ہاسین۔ سب۔ سبن۔ گھوڑا۔ گھوڑن۔

(۱۲) برج اردو فعل معاون 'ہوا' کی جگہ 'بھیو' اور اس کے صیغے اور 'تھا' کی جگہ 'ہتو' استعمال کرتی ہے۔ جیسے ایسیں سہر ادھی گائے شری جی کے بھینٹ بھئیں۔ (ایسی ہزار گائیں شری جی کو بھینٹ ہوئیں)

(۱۳) لاحقہ مصدری اردو میں 'نا' ہے۔ برج میں 'بو' اور 'بوں' جیسے کربوں (کرنا)، چل بو (چلنا)

(۱۴) برج 'سیں' اور 'تے' دو ابتدائی لاحقے استعمال کرتی ہے۔ لیکن اس کا اپنا لاحقہ 'تے' ہے 'سیں' اس نے اردو سے وضع کیا۔

(۱۵) برج اردو سے پچھڑی ہوئی ہے کہ اس میں اسماء صفات اور ضمائر کی تصریف باقاعدہ اور منظم نہیں۔ اردو میں نظم و باقاعدگی ہے 'وہ' (ضمیر واحد غائب) فاعلی حالت میں

ہے ۔ 'کو' (علامت مفعول) کے بعد بھی یہ 'ہ' ہی رہتی ہے ۔ جیسے 'اہ پوتھی کوں (اس پوتھی کو)
جمع کی صورت میں اسم کی تصریف نہیں ہوتی ۔ فاعلی اور غیر فاعلی دونوں حالتوں میں وہ یکساں
رہتا ہے ۔ جیسے لوگن (لوگ)، لوگن نے (لوگوں نے) لوگن کو (لوگوں کا) وغیرہ ۔

(۱۶) اردو میں امر تعظیمی کے دو صیغے ہیں ۔ کریئے ۔ پڑھیئے ۔ کیجیئے ۔ پیجیئے (دیکھیے پیجیے)
برج میں ایک ہے ۔ کرجے ۔ کریجے ۔ پڑھجے ۔ پڑھیجے ۔

(۱۷) برج میں فعل مجہول اردو کی طرح 'جا' کی مدد سے بنایا جاتا ہے ۔ لیکن اردو 'جا' اور
اس کے صیغوں میں اضافہ ماضی مطلق (حالیہ تمام) پر کرتی ہے اور برج حالیہ تمام اور طورے
دونوں پر ۔ جیسے پڑھ جائے ۔ پڑھیو جائے ۔

(۱۸) برج 'تک' کی جگہ اور اس کے معنی میں عام طور سے لَوں یا لوں استعمال کرتی ہے

ڈاکٹر گریرسن نے برج کی حسب ذیل صوتی خصوصیات بتائی ہیں جو اسے اردو
سے ممتاز بناتی ہیں ۔

(۱) 'ر' اگر حرف صحیح سے پہلے ہو تو گر جاتی ہے اور حرف صحیح مشدد ہو جاتا ہے جیسے
مدّ (مرد) مجّا (مرجا)، متّوں (مرت ہوں)، توکّن سوں (تو کرن سوں) ۔

(۲) 'و' کی آواز متعین نہیں ۔ 'واو' اور 'ب' کے درمیان اس کا تلفظ ہوتا ہے ۔ لیکن
طویل حرف علت کے بعد 'و' 'م' سے بدل جاتا ہے ۔ جیسے باسن (باون) مہاں
(وہاں)، آمت (اے آوت ہے = آتا ہے) مناس (مناون)

(۳) ہائیہ حروف کی 'ہ' اکثر حذف ہو جاتی ہے ۔ جیسے ۔ اوں (ہوں)، اے (ہے)،
ایں (ہیں)، اُو (ہو، تھا)

اس کے علاوہ برج کی دو ایک صرفی نحوی امتیازی صفات کی طرف بھی ڈاکٹر
گریرسن نے توجہ دلائی ہے ۔

(۴) رشتے ظاہر کرنے والے اسما جو فاعلی حالت میں الف پر ختم ہوتے ہیں بغیر

فاعلی حالت میں حسب قاعدہ منصرف نہیں ہوتے یا یوں کہئے کہ 'ے' کی جگہ راجستھانی کی طرح غیر فاعلی حالت میں ان کے آخر میں 'ا' ہوتا ہے: جیسے لوہرے بیٹا نے چھوٹے بیٹے نے)۔[1]

(۲) برج میں فعل حال بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ مادے کے آخر میں 'ے' بڑھا کر 'ہے' اور اس کے صیغے: اضافہ کر دیتے ہیں۔ مارَتے ہَوں (مارتا ہوں) مارَتے ہے (مارتا ہے) مارَتے ہَیں (مارتے ہیں) 'مارے' میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

(۳) 'نے' فعل ماضی لازم کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے لوہرے بیٹا نے چَلیو (چھوٹے بیٹے نے چلا = چھوٹا بیٹا چلا)۔

اس فہرست پر جس میں اختصار کے ساتھ اردو اور برج کے لسانی بنیادی اختلافات پیش کئے گئے ہیں ایک نظر ڈالنے کے بعد بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اُردو برج سے مختلف، آزاد اور مستقل زبان ہے۔ البتہ یہ دکھانے کے لئے کہ اردو برج سے زیادہ قدیم ہے وہ برج سے ماخوذ نہیں ہو سکتی مذکورہ بالا صرفی و صوتی اصول و قواعد کا جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقا اور ان کی تاریخ کی روشنی میں تجزیہ کرنا ضروری ہے۔

عام طور سے زبان میں صیغوں یا تعمیری کلموں کی تکرار اور ان میں تعدد نہیں ہوتا۔ مثلاً 'نا' مصدری لاحقہ ہے۔ 'گا' استقبالی ہے اور 'کو' مفعولی۔ 'نے' کی مدد سے ابتدایا وساطت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اُردو میں مصدریت، استقبال، مفعولی، اور مجروری حالتیں ان علامات سے ظاہر کی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے بیان کا کوئی طریقہ نہیں

---

[1] ۔ مولانا شیرانی اسے تعریف کی غلطی بتاتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں برج میں 'نے' 'ا' بھی غیر فاعلی لاحقہ ہے۔ بلکہ عام طور سے 'ا' پر ختم ہونے والے اسماء جیسا کہ گریرسن نے لکھا ہے غیر فاعلی حالت میں 'ا' ہی پر ختم ہوتے ہیں (جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۷۶)۔

جن زبانوں میں ایک حالت کے اظہار یا صیغے کی تعمیر کے لئے ایک سے زیادہ علامتیں ہیں ان میں سے ایک علامت اس زبان کی ہے باقی دوسری قریب کی زبانوں سے لے کر اپنا لی گئی ہیں۔ انگریزی میں سابقوں اور لاحقوں کی کثرت کی وجہ، جیسا کہ ماہرین لسانیات نے لکھا ہے یہ ہے کہ انگریزی نے دل کھول کر لاتینی، یونانی وغیرہ زبانوں سے استفادہ کیا۔ یہ سابقے و لاحقے ان زبانوں کے ہیں جو اینگلو سیکسن تعمیری کلمات کے دوش بہ دوش انگریزی میں رائج ہیں۔ بے کل اور بڈھل میں 'بے' اور 'ب' (سنسکرت وِ) دو لاحقے ایک معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ 'بے' فارسی ہے اور 'ب' ہند آریائی۔ 'نامعقول' اور 'انمول' میں 'نا' فارسی ہے اور 'ان' ہند آریائی۔ یہ اصول بہت واضح ہے، قیاسِ صحیح اس کا موید ہے، زبانوں کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ اس[1] مزید توضیح و تفصیل غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔

برج بھاشا میں ایک صیغے کی کئی کئی شکلیں ہیں۔ تعمیری کلمے جن کی مدد سے صیغے ڈھالے جاتے ہیں، اسماء و افعال گردانے جاتے ہیں ایک سے زیادہ ہیں ان صیغوں کی چھاپ اور تعمیری لفظوں کی ہیئت کہیں کہیں برج بھاشا کی فطرت اور اس کے مزاج کے منافی یا ناموافق بھی ہے۔ صیغے اور کلمے برج کے کسی قدیم روپ سے تال پاکر نہیں بنے۔ برج نے پاس پڑوس کی کسی بولی سے مستعار لئے شروع میں میں نے اس قسم کے چند کلمات کا ذکر کیا تھا اور لکھا تھا کہ یہ کلمے برج میں اردو سے گئے۔ اوپر اردو اور برج کے اختلافات کا جو خاکہ پیش کیا گیا اس میں اس قسم کے کئی صیغے ہیں۔ علامتِ استقبال "گو" اور "نو" مصدری کی بابت جن کا استعمال برج میں دیکھا گیا ہے مولانا شیرانی فرماتے ہیں[2] کہ یہ برج کی ملکیت نہیں۔ برج نے اردو سے لیئے۔ ڈاکٹر چیٹرجی لکھتے ہیں[3]

---

[1] پنجاب میں اردو طبع دوم صفحہ ۱۵۰ [2] گوڑیں گرامر مقدمہ صفحہ ۵۔

"برج میں جہاں کسی صیغے کے دو روپ ہیں ان میں سے ایک اردو نے اختیار کر لیا۔ برج میں 'کرہوں' 'کروں گو' فعل مستقبل (صیغہ واحد متکلم) کے دو صیغے تھے۔ اردو نے ان میں سے دوسرا پسند کیا اور اسے 'کروں گا' بنا لیا اس لیے کہ وہ پنجابی "کراں گا" کا ہم شکل تھا۔"

یہ قیاس اور حقیقت دونوں کے خلاف ہے۔ قیاس کے خلاف اس لیے کہ کسی زبان میں جیسا کہ میں نے عرض کیا، کسی صیغے کی تعمیر صرف ایک کلمے سے ہوتی ہے۔ (الا یہ کہ کسی دوسری زبان سے کوئی کلمہ لے لیا گیا ہو) برج میں 'گو' اور 'ہوں' دو کہاں سے آئے؟ یہ دونوں برج کے نہیں ہو سکتے۔ ان میں سے ایک (ہوں) برج کا ہے۔ 'گو' اردو نے برج سے لیا تھا تو اسے اپنے مزاج اور رجحان طبع کے مطابق 'گو' بنا لینا تھا ('کوں' کی شکل اردو میں 'کو' ہے) گا نہ لگایا ضرور تھا۔ 'جو' 'سو' 'تو' وغیرہ 'و' پر ختم ہونے والے اشارے اور ضمیریں پہلے ہی اردو میں موجود تھیں 'گو' بھی انہی میں شامل ہو جاتا۔ میرزا خان کا بیان ہے کہ برج میں مفعول کی کوئی جداگانہ علامت نہیں اس کی بجائے مکسور 'ہ' سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ جیسے راونہِ (راون کو) برہمنہِ (برہمن کو)۔ رامہِ (رام کو) 'گا' کی مدد سے استقبال کا اظہار برج کے تالیفی مزاج کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ 'کرہوں' 'کروں گو' سے زیادہ قدیم ہے۔ برج کے قدیم ادب میں لاحقہ 'ہوں' استعمال ہوا ہے۔ راسو پر برج کی چھاپ ہے۔ اس میں 'گو' نہیں دیکھا گیا اس لئے 'گو' برج کے دامن میں نہیں باندھا جا سکتا۔

'سیں' (سے) 'کوں' (کو) 'نوں' (نا) 'میں' برج نے اردو سے لیے اور اپنے مزاج کے مطابق غنہ بڑھا کر انہیں اپنا لیا ہے، 'ہ'، 'بو' اور 'نوں' جو ترتیب شدہ 'کو' 'نا' اور 'میں' کے قائم مقام ہیں برج کے ہیں۔

برج پر اردو کے اصلی اثرات بھی ہیں۔ 'کرت ہے' وغیرہ فعل حال کا ذکر میں نے پہ

کر گیا ہوں کہ ان صیغوں کو برج نے اُردو کرتا ہے نے لیا۔ چند اور ملاحظہ ہوں۔

(۱) اسماء کی غیر فعلی حالت برج میں نہ تھی۔ یہ اس نے اردو سے لی۔ اس نے ایک طفلِ نوآموز کی طرح صحیح طور سے وہ اس کو برت نہ سکی۔ برج میں صیغہ جمع کی صرف ایک حالت ہے گھوڑن (فاعلی) گھوڑن نے (غیر فاعلی) ڈاکٹر گریرسن کہتے ہیں[۱] متھرا میں تھوڑے دناں پاچھے (تھوڑے دن پیچھے) لوا جاتا ہے۔ یہاں برج بھاشا دن کی جگہ "دناں" راجستھانی اثر ہے۔ بعض اسماء صفات اور ضمیریں فاعلی اور غیر فاعلی دونوں حالتوں میں یکساں رہتی رہیں۔ جیسے گھوڑاکوں (بجائے گھوڑے کوں) آہ پوتی کوں (بجائے وا پوتی کوں) لہرے چھوراکوں (بجائے لہرے چھورے کوں)

(۲) جس مادے پر لاحقہ اضافہ ہو برج میں اُسے مکسور الآخر ہونا چاہیے۔ جیسے کرِ۔ پڑھِ۔ چھوڑِ۔ کرِ ہَیں (کرے گا) کرِ بَوں (کرنا) کرِ جائے (کرا جائے)۔ پڑھِ ہوں۔ پڑھِ ہیں۔ پڑھِ جائے۔ چھوڑِ ہیں۔ چھوڑِ جائے۔

اُردو سے گا لے کر برج نے اس طرح گردانا۔

(متکلم)	کروں گو	کریں گے
(حاضر)	کرے گو	کرو گے
(غائب)	کرے گو	کریں گے

یعنی برج نے اپنے مزاج کے مطابق مادے کو کسرہ دے کر اس پر گا نہیں بڑھایا۔ اردو کی تقلید میں "گو" فعل حال (مضارع) پر داخل کیا۔ اردو کی طرح اس کی گردان کی (گو۔ گے۔ گی۔ گا۔ گے) اور لاحقہ کو گردانے کی بجائے فعل کو گردانا حالانکہ استقبالی لاحقے کو مادے پر (جو بہ حقیقت قدیم حالیہ تمام ہے) یا حاصل مصدر پر داخل کر کے وہ کر گیا مرت گو کہہ سکتی تھی جیسا کہ اس نے تالیفی مستقبل

[۱] لسانیاتی جائزہ جلد ۹ حصہ اول صفحہ ۷۶۔

اور حال استمراری کی صورت میں کیا۔

تاکیدی مستقبل		حال استمراری	
کرہوں	کرہیں	مارے ہوں	مارے ہیں
کرہے	کرہو	مارے ہے	مارے ہو
کرہے	کرہے	مارے ہے	مارے ہو

ان دونوں میں اصل فعل میں کوئی تغیر نہیں ہوا فعل معاون بدلتا رہا۔

(۳) حالیہ تمام (اسم مفعول) کی علامت سے پہلے اردو کے سوا مغرب کی تقریباً تمام جدید زبانوں میں کسرہ ہوتا ہے۔ مثلاً پنجابی میں "یا" نہ ہے، سندھی میں ہے "ے" یا "یے" یا "ب" نیپالی میں "ے" یا "یے" یا "ب"۔ برعکس برداتی کی قدیم ہندی میں جو برج کی ماں ہے "ی" "د" یا "یو" کی شکل میں تھا لیکن برج سے غائب ہے۔ برج میں حالیہ تمام علامت "یو" یا "یو" ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی تعمیر میں اردو اور گجراتی اثرات کو دخل ہے۔ اردو میں حالیہ تمام کی علامت "ے" "ا" ہے (چلا گیا، وغیرہ) اور گجراتی میں "یو"۔ برج نے ان کو جوڑ کر "یو" بنایا۔ یہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ امر سے پہلے زیر تھا جس کے اثر سے علامت کے آخری "ے" نے (سنسکرت "ت" پراکرت "ے") ی کا روپ اختیار کیا۔ اس کے علاوہ فعل مجہول "پڑھ جائے" (اردو پڑھا جائے) میں یہ کسرہ موجود ہے۔ اگرچہ برج میں "پڑھ جائے" کے ساتھ "پڑھیو جائے" بھی ہے لیکن پہلا صیغہ شاید ان میں زیادہ قدیم ہے۔

برج اور اردو کی خصوصیات ذیل اس امر کی گواہ ہیں کہ اردو کا لسانی سرمایہ

لہ گریرسن نے لکھا ہے:۔ "ی" کو صحیح طور سے صرف حالیہ تمام میں پاتی ہے۔ قدیم سنسکرت جو کا نتیجہ ہے اس کے مدارج اس طرح پر ہیں: سنسکرت "مارتکہ" پراکرت "مارو" "مارئو" "مارد" بنتا "ماریو" (جلد نہ ۹ حصہ اول صفحہ ۷۳)

علیحدہ پیچیدہ اور بعض حیثیتوں سے زیادہ قدیم ہے۔ وہ برج سے کسی طرح بھی ماخوذ نہیں ہو سکتا
(۱) اردو میں تعدیہ کی دو قسمیں ہیں بلا واسطہ یعنی لازم کو متعدی بنانا۔ اور بالواسطہ یعنی
متعدی کو متعدی بنانا۔ تعدیہ کے دو طریقے ہیں:-

(الف) مادے کی درمیانی حرکت کا گن (اشباع حروف) جیسے کٹ سے کاٹ۔
بندھ سے باندھ پٹ سے پیٹ یا ڈھ دھی (اشباع مجہول) ے کی جگہ ے و اور ب کی جگہ
پ سے) جیسے کھنچ سے کھینچ۔ کھل سے کھول۔ چھٹ سے چھوڑ یہ تعدیہ بلا واسطہ ہے
(ب) مادے کے آخر میں "ا" یا "وا" کا اضافہ جیسے کر سے "کرا" یا "کروا"۔ پڑھ سے
"پڑھا" یا "پڑھوا"۔ اٹھ سے "اٹھا" یا "اٹھوا" یہ تعدیہ بالواسطہ ہے پہلا بیک واسطہ دوسرا
بہ دو واسطہ۔

مادے کے آخر میں "ا، و، ی" میں سے کوئی حرف نہ ہو تو اس کی جگہ "ل" ہو گا۔
جیسے کھا سے کھلا۔ کھلوا۔ پی سے پلا۔ پلوا۔ سو سے سلا۔ سلوا۔ جی سے جلا۔ جلوا۔
سی سے سلا۔ سلوا وغیرہ۔

اس کے مقابلے میں برج، جیسا کہ میں نے عرض کیا، "ا، و" کے اضافے سے
(جو معلول الآخر افعال میں "وا" ہو جاتا ہے) فعل کو متعدی بناتی ہے۔ جیسے پڑھ سے پڑھاؤ
کھا سے کھواؤ۔ دے سے دواؤ۔ دیکھ سے دکھاؤ۔ سیکھ سے سکھاؤ۔

(۲) اردو میں جمع بنانے کا قاعدہ اتنا پیچیدہ ہے کہ برج کے آسان اور سادہ ترین
قاعدے سے اسے کوئی نسبت نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(اردو)

مفرد	جمع (فاعلی)	جمع (غیر فاعلی)
مرد	مرد	مردوں
گھوڑا	گھوڑے	گھوڑوں

(برج)

(مفرد)	جمع (فاعلی و غیر فاعلی)
گھوڑو	گھوڑے
برج باسی	برج باسین

سب بین بلا بلائیں بلاؤں

مؤنث { کرسی کرسیاں کرسیوں
عورت عورتیں عورتوں

(۳) امر تعظیمی برج میں بھی ہے اور اردو میں بھی لیکن اردو کا نظام برج کے مقابلے میں کسی قدر مفصل ہے۔ اردو میں امر تعظیمی کے دو لاحقے ہیں یے۔ جئے (جے) پہلا ان مادوں کے آخر میں اضافہ کیا جاتا ہے جو حرف صحیح یا الف پر ختم ہوں اور دوسرا 'ی' یا 'و' پر ختم ہونے والے مادوں پر۔ جیسے پڑھ سے پڑھیے۔ لکھ سے لکھیے۔ کی سے کیجئے۔ دے سے دیجئے۔ لے سے لیجئے۔ ہو سے ہوجئے۔ برج میں صرف ایک لاحقہ 'جے' ہے جو بلا امتیاز تمام مادوں پر جوڑا جاتا ہے۔ کہیں اصل مادے پر اور کہیں مادے پر 'ـِ ی' زائد معروف بڑھانے کے بعد جیسے پڑھی جے یا پڑھجے۔ کری جے۔ یا کرجے۔

یہاں اُردو کے ایک رجحان کی وضاحت ضروری ہے۔ اُردو میں دو حرفِ علت یا حرکات کا اجتماع ثقیل اور ناروا سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً اور مشرقی ہندی میں "اَو" ہے۔ اردو "اَو" کو پسند نہیں کرتی۔ اردو کے جو دو اصول اوپر بیان ہوئے ان میں اُردو کا یہ صوتی رجحان صاف جھلکتا ہے۔ پہلی صورت میں مادے کے آخری ا - و - ی کی جگہ 'ل' اس لئے آیا کہ مادے کے ان حروف کا لاحقہ کے 'ئے' یا 'وا' کے ساتھ اجتماع نہ ہو۔ وہ الگ رہیں۔ تیسری صورت میں 'ل' کا کام 'ج' نے انجام دیا۔ وہ مادے کی 'ی' یا 'و' اور لاحقہ کی 'ئے' کے درمیان ڈٹ گیا تاکہ وہ ایک دوسرے سے ملنے نہ پائیں۔ یہ اردو کا مزاج ہے جو برج کی سرشت اور اس کی نظری افتاد کے خلاف ہے۔ اس کا ذکر میں نے اوپر کہیں کیا تھا۔

(۴)

"اُردو اور پنجابی"

اب تیسرے نظریے کو لیجیے "کہ اُردو پنجابی سے ماخوذ ہے۔ میں اس پر ذرا تفصیل سے بحث کرنا چاہتا ہوں مولانا شیرانی مرحوم کی قابل قدر کتاب پنجاب میں اردو[1] کی اشاعت کے بعد یہ نظریہ زیادہ زور پکڑ گیا ہے، اور اہل علم دھوکے میں پڑ گئے ہیں کہ:۔

"اردو کی بنیاد وہ بولی ہے، جیسا کہ ہندو عالموں کا خیال ہے، جو دہلی، آگرہ اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی یا ڈاکٹر گراہم بیلی کے خیال کے مطابق اُردو پنجاب کی بولی ٹھولی سے ترقی پاکر بنی ہے[2]"

ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو پنجابی کی صوتی، صرفی، نحوی خصوصیات اور لفظی سرمایہ پیش کر کے دکھایا جائے کہ خِلقت و فطرت اور مزاج و منہاج کے لحاظ سے اردو پنجابی سے مختلف زبان ہے۔ اردو پنجابی کے اہم بنیادی اختلافات درج ذیل ہیں:

(۱) اردو سنائی ن پنجابی میں لسانی (حلقی) ں نرٹ ہے۔

---

[2] بلیٹن اسکول اورینٹل اسٹڈیز جلد ۸ صفحہ ۲۷۹

(۲) پنجابی قدیم 'س' کو 'ہ' سے بدل لیتی ہے جیسے۔ ایہا (ایسا) جیہا (جیسا)
ایہہ (اس) وَرہ (برس) ورھدا ہے (برستا ہے) سہرا (سسرا) وغیرہ
ذیل کے کلمات کا 'س' پہلے 'ہ' ہوا اس کے بعد پنجابی لہجے کی نذر ہو گیا۔
بی (بیس)، تی (تیس)، چالی (چالیس)، اُنی (انیس)، اکی (اکیس)، اکاٹھ (اکسٹھ)۔
پینٹھ (پینسٹھ)۔ چھیاٹھ (چھیاسٹھ)

(۳) پنجابی 'ہ' کا تلفظ نہیں کر سکتی وہ تنہا 'ہ' اور مخلوط بہا حروف کے ھائیہ
عنصر کو ایک خاص لہجے کے ساتھ ہمزہ (ء) سے بدل لیتی ہے جیسے پُکھ (بھوک)۔
تیئاں (دھیان)، ڈگا (ڈھگا)، کوڑا (گھوڑا) وغیرہ۔

(۴) پنجابی کلمات کی درمیانی علت گرا دیتی ہے۔ جیسے ٹٹنا (لوٹنا)، دِک (دیکھ) کھنڈ۔
(کھانڈ) ڈبا (ڈوبا)۔ ہندی الفاظ کی خصوصیت نہیں۔ پنجابی نے اپنے مزاج کے مطابق
فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ عربی کی 'ح' اور 'ع' بھی کا تلفظ پنجابی
میں 'الف' سے مشابہ تھا پنجابی کے اس تلفظ کی نذر ہو گئے۔ جیسے بزّتی (بے عزتی)
ملوم (معلوم)، مبوب (محبوب) تکید (تاکید)

(۵) پنجابی درمیانی حرف علت حذف کر کے اس کے بعد کے حرف صحیح کو مشدد
کر لیتی ہے، چاہے وہ احادی المقطع یعنی یک جزے ہی کیوں نہ ہوں۔ جیسے
تِنّ (تین)، اِکّ (ایک)، کنّ (کان)، کمّ (کام)، نکّ (ناک)، ہتھّ (ہاتھ)

(۶) 'ں' (مغنونہ) کی جگہ پنجابی 'ن' استعمال کرتی ہے۔ ھن گے (ہیں گے)،
ھن گی آں (ھیں گی)، ہون گے۔ ھون گی آں (ہوں گے۔ ہوں گی)۔

(۷) ذیل کے کلمے میں پنجابی کا میلان مغنونہ کی طرف ہے۔
یاراں (گیارہ) باراں (بارہ) تیراں (تیرہ) چوداں (چودہ) سولاں (سولہ)۔

(۸) پنجابی دو یا دو سے زیادہ حرکات علل کا اجتماع (HIATUS) گوارا

کر لیتی ہے۔ اردو کو یہ پسند نہیں۔ اوپر کی مثالوں میں 'گی آں' اردو کے مزاج کے خلاف ہے وہ 'گیاں' کہے گی۔ 'گھوڑیج آں' اردو میں 'گھوڑیاں' ہے۔

(۹) پنجابی نے الف کو س سے بدلا اور 'ہ' کو الف سے۔ جیسے ہک (ایک) ہور (اور) ہسوار (اسوار) کروا لے (کرتا ہے) کرجے اور (کرتے ہیں) کرجا آں (کرتا ہوں)

مذکورہ بالا کلمات کا 'س' اور 'الف' 'ہ' سے زیادہ قدیم ہے اس لئے مولانا شیرانی کا یہ فرمانا درست نہیں کہ پنجابی کی 'ہ' اردو میں 'س' یا 'الف' سے بدل گئی

۱۰ پنجابی کا 'و' اردو میں عام طور 'ب' ہو جاتا ہے پنجابی اس باب میں اردو سے زیادہ قدامت پسند ہے۔

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو
وچ	بیچ	وگاڑ	بگاڑ
وس	بس	واری	باری
وچارا	بچارا (بے چارہ)	ویاج	بیاج
وجلی	بجلی	ورف	برف

صرفی نحوی، اختلافات ملاحظہ ہوں۔

(۱) ماضی مطلق (متعدی) کے فاعل (آلی) پر اردو میں 'نے' آتا ہے۔ پنجابی نے اردو سے لے کر اسے 'نیں' بنایا۔ اس کی تفصیل آئندہ سطروں میں ملاحظہ ہو۔

(۲) علامت مفعول 'کو' کی جگہ پنجابی 'نوں' استعمال کرتی ہے۔ جنم ساکھی میں ایک دو مقامات کے علاوہ ہر جگہ 'نوں' آیا ہے[1]۔

(۳) را۔ ری۔ کا۔ کی کے ہم معنی اضافی لاحقے پنجابی میں ڈا۔ ڈی اور دا۔ دی ہیں۔

(۴) 'سے' اردو ہے۔ اس کے پنجابی مترادفات 'تے۔ توں۔ بتی بتوں' وغیرہ ہیں۔

(۵) ظرفیت کے لئے اردو میں 'میں' ہے اور پنجابی میں 'وچ'۔

---

[1] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۳۶ء صفحہ ۷۱

(۶) ماضی بعید اور ماضی استمراری کی گردان اردو میں 'تھا' کی مدد سے کی جاتی ہے جس کے دو صیغے ہیں۔ تھا (واحد) تھے (جمع) پنجابی میں 'سی' کی مدد سے اس کی گردان اس طور پر ہے۔

سی۔ سن۔ سیں۔ سو۔ ساں

(۷) اردو میں حالیہ تمام (فعل حال) 'ت' پر ختم ہوتا ہے اور پنجابی میں 'د' پر لیکن پنجابی کے جو مادے 'الف' پر ختم ہوئے ہیں۔ ان میں 'ن' بھی ہے جیسے۔

(پنجابی)	(اُردو)
لکھدا۔ لکھدے	لکھتا۔ لکھتے
پڑھدا۔ پڑھدے	پڑھتا۔ پڑھتے
ہوندا۔ ہوندے	ہوتا۔ ہوتے
آوندا۔ آوندے	آتا۔ آتے
جاوندا جاوندے	جاتا۔ جاتے

(۸) حالیہ تمام (ماضی مطلق) کے آخر میں عام طور سے اردو میں 'ا' ہوتا ہے۔ اور پنجابی میں 'ـآ' جیسے

(پنجابی)	(اُردو)
چل آ	چلا
کہِ آ۔ آکھِ آ	کہا
مارِ آ	مارا

کیتا (کیا) دِتا (دیا)، ستا (ڈالا) خلاف قاعدہ ہیں۔

(۹) فعل حال کے مندرجہ ذیل صیغے اُردو صیغوں سے مختلف ہیں۔

(پنجابی)	(اُردو)
(میں) کراں	(میں) کروں
(اسی) کریئے	(ہم) کریں
(تو) کریں	(تو) کرے

یہ فعل حال شرطیہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ پنجابی اس فعل پر 'گا' اضافہ کر کے مستقبل کے صیغے وضع کرتی ہے تو واحد اور جمع (متکلم) میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ جیسے میں کراں گا۔ اسی کراں گے۔ اُردو میں حسب قاعدہ یہ صیغے اس طرح ہیں۔ میں کروں گا۔ ہم کریں گے۔

(۱۰) پنجابی، گجراتی اور مارواڑی کی طرح لاحقہ "سی" کی مدد سے فعل مستقبل بناتی ہے۔ 'گا' اس نے اردو سے لیا۔ جیسے۔ جویں تسی آکسو تویں کراں گے (جیسے تم کہو گے ویسے ہی کریں گے)

(۱۱) غیر فاعلی حالت میں اردو اسما کی جمع 'وں' کے اضافے سے بنتی ہے اور پنجابی میں 'آں' کے اضافے سے جیسے۔

(پنجابی)	(اُردو)
گوڈی آں دا	گھوڑیوں کا
گلاں تے	باتوں سے

جن مؤنث اسمائ کے آخر میں 'ی' ہے پنجابی ان پر 'ائیاں' بھی بڑھاتی ہے چنگی سے چنگیاں اور چنگیائیاں۔ نانک کا دوہا ہے :۔

چنگیائیاں سہریاں نہاں والے دھرم دوری   کرمی اپو آپنڑیں کے نیڑے کے دوری

(۱۲) بلا کی جمع اردو میں بلائیں (یائے مجہول سے) ہے اور پنجابی میں بلائیں (یائے معروف سے)۔

(۱۳) الف پر ختم ہونے والے اسماء اگر مفرد ہیں تو بصورت منادی ان کے آخر میں اردو میں 'ے' ہوگا۔ جیسے او لڑکے اور پنجابی میں 'یا' جیسے او منڈیا۔

(۱۴) اردو کے حسب ذیل اسماء اشارہ کے اول میں 'ی' یا 'و' ہے پنجابی ان کا تلفظ 'الف' سے کرتی ہے۔ جیسے یہ (اہ) وہ (اوہ) یہاں (ایتھے) وہاں (اوتھے) مشرق کی جدید آریائی زبانوں کی طرح پنجابی کو 'ی' اور 'و' سے کلمے کا آغاز ناپسند ہے۔

(۱۵) پنجابی میں امر حاضر (جمع) کے دو صیغے ہیں۔ کرو۔ کریو (یائے معروف)۔ اردو میں صرف 'کرو' ہے۔

(۱۶) پنجابی اور اردو کی ضمیریں بھی مختلف ہیں۔

(اردو)	(پنجابی)	(اردو)	(پنجابی)
میں۔ ہم	ہوں۔ اسی (اسیں)	ہمارا	اساڈا
تو۔ تم	تو۔ تسی۔ (تسیں)	تمہارا	تواڈا۔ تساڈا۔

(۱۷) اردو میں مجہول صرف 'جا' کی مدد سے بنتا ہے۔ پنجابی 'جا' کے علاوہ 'ی' لگا کر بھی مجہول بناتی ہے۔ 'ـآں' اس کی جمع ہے جیسے۔ کر آجاوے یا کری اے۔ کریاں۔ کڈھاں۔ چن چن کڈھاں۔ (چن چن کر نکالیں (جنم ساکھی صفحہ ۱۵۳)

(۱۸) اردو عام طور سے مادے پر 'ے' بڑھا کر امر تعظیمی بناتی ہے۔ لیکن 'ی' اور 'ہ' پر ختم ہونے والے مادوں میں 'ے' سے پہلے 'ج' اضافہ کر دیا جاتا ہے، جیسے۔ کیجے۔ پڑھیے۔ کیجیے۔ پیجیے۔ دیجیے۔
قدیم پنجابی میں جیسا کہ صبور نے لکھا ہے 'اتّ' یا 'ات' مادے پر اضافہ کر کے تعظیم کا مفہوم پیدا کیا جاتا تھا جیسے کری اتّ (کریں) الکھی اتّ دیکھیے)

لے ڈاکٹر گریرسن کہتے ہیں اسی قسم کا فعل مجہول جسے پنجابی ادب میں بہت کم ملتا ہے (جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۶۱۶)

(۱۹) پنجابی کسی قدر تالیفی زبان ہے۔ اردو میں کہیں کہیں ظرفی حالت کی علامت (ے) دیکھی گئی ہے (سویرے۔ کنارے وغیرہ) پنجابی میں عام طور سے اس لاحقے سے کام لیا جاتا ہے۔ جیسے اس دی درگاہے (اس کی درگاہ میں) اس دے گھرے (اس کے گھر میں)۔ حسب ذیل تالیفی لاحقے پنجابی میں مستعمل ہیں۔

۱۔ ـو۔ وں' (واوِ مجہول) ابتدائی حالت کے لئے۔ جیسے گھروں (گھر سے)

۲۔ ـے۔ یں۔ (یائے معروف) ظرفیت کے لئے۔ جیسے گھریں (گھر میں)

۳۔ ـے۔ یں (یائے معروف) آلی کے لئے۔ اس دے ہتھیں (اس کے ہاتھوں سے)

(۲۰) ماجھے کے علاقے کی پنجابی میں فعل کے ساتھ متصل ضمیر بھی دیکھی گئی ہیں جیسے آکھ اس (آکھے آ = کہا۔ اس = اس نے) اس نے کہا۔

(۲۱) بنگالی کی طرح پنجابی میں 'جے' ایک فعل ہے۔ جس کے معنی ہیں 'ہے' جیسے کی جے (کیا ہے) کی آکھے آ جے (تم نے کیا کہا) بنگالی زبان میں کہتے ہیں او بے (وہ ہے)

(۲۲) گریرسن نے 'گا' کے علاوہ ایک لاحقہ 'وا' کا ذکر کیا ہے۔ جس کی مدد سے شمالی پنجابی فعل مستقبل بناتی ہے۔ جیسے وساں وا (میں بتاؤں گا یا کہوں گا)

(۲۳) اردو میں اختتامِ فعل کا اظہار 'گیا' 'بنا' 'چکا' وغیرہ افعال کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ جیسے چلا گیا۔ چلتا بنا۔ کھا چکا۔ پنجابی 'رہا' سے یہ کام لیتی ہے۔ جیسے چلدا رہا (چلا گیا) چلدے رہے (چلے گئے) فعل حال پر 'رہا' داخل کرنے سے اردو میں استمرار کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ چلتا رہا۔ چلتے رہے۔ وغیرہ۔

(۲۴) پنجابی استمرار کا اظہار 'و' کی مدد سے کرتی ہے۔ جاندا ودا اے (جا رہا ہے یا جاتا رہتا ہے) لیکن عام طور سے 'پیا' (پین = پڑنا) سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ آوندا پیا۔ پیا آوندا (آ رہا ہے)

(۲۵) علامت تعدیہ پنجابی میں "ے" "وے" یا "اے" "ال" اردو میں "ے" "ا" یا "ن" جو دیلئے ت

چھوڑنا (چھوڑانا) کھلانا (کھلانا) سکھاؤنا (سکھانا) سکھالنا (سکھلانا) وغیرہ

(۲۶) ذیل کے کلمات و حروف پنجابی کے ساتھ خاص ہیں۔ اردو انھیں نہیں برتتی۔ تو تڑے۔ تائیں۔ لگ (تک) کول (پاس) نال (ساتھ) ھنڑ (اب) نیڑے (نزدیک) وانگر وانگوں (مثل) بھی۔ بھلکڑوں (بلکہ) جے۔ جیکدھاں جے کہ (اگر) ول۔ ولا (پھر) اتے (اور) اجنڈا (پھر بھی) وچا (فعل معاون) کیتے (لئے) سوب (وجہ سے) تاں (پس) دو (طرف) بھاویں (چاہیں) دسنا (بتانا)۔ پیو (باپ) ماؤں (ماں)

(۲۷) ذیل کے کلمات اردو کلمات سے کسی قدر مختلف ہیں۔

دی (بھی) اینویں (یونہی) اونویں (ووہنی) کیویں (کیسے) جیویں (جیسے) تیویں (تیسے) جدتڑ۔ جداں (جب) تداں تدھاں (تب) اتھاں (یہاں) اتھاں (وہاں) کتھاں جتھاں اچاچیت (اچانک) آکھنا (کہنا) ساہ (سانس) تہ (تیہا) (تیزی)۔

اردو اگر پنجابی سے ماخوذ ہوتی تو اس کی حیثیت پنجابی کی ایک بولی یا شاخ سے زیادہ نہ ہوتی۔ اور یہ قریب قریب طے ہو چکا ہے کہ کسی زبان کی شاخ، جسے اپنی اصل سے بچھڑے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو بنیادی طور پر اصل سے مختلف نہیں ہوتی: مولانا شیرانی کے لفظوں میں[1] (برج کی جگہ پنجابی رکھ کر)

"جب ہم اردو کے ٹھوڑلی، اس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے۔ اور پنجابی کا رنگ اور۔ دونوں کے قواعد و ضوابط و اصول مختلف ہیں"

اس کے بعد:۔

"پنجابی سے چند ترمیمیں قبول کر لینا یا الفاظ کا مستعار لینا دوسری بات ہے۔ لیکن

---

[1] پنجاب میں اردو (طبع دوم) صفحہ ۹۴ - ۸۴

جہاں پنجابی سے اس نے الفاظ مستعار لئے ہیں وہاں پنجابی پر اپنا اثر بھی ڈالا ہے۔ اور پنجابی پر کیا موقوف ہے ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اردو کے پرتو سے خالی نہیں۔"

اردو اور پنجابی کے رشتے کی تعیین تو میں بعد میں کروں گا جہاں اردو کے ماخذ سے بحث کی جائے گی۔ یہاں یہ امر واضح کرتا چلوں کہ اردو اور پنجابی ان تمام لسانی مشابہتوں کے باوجود، جن کا ذکر مولانا محمود شیرانی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں کرتے ہیں، اصلاً اور ساخت کے اعتبار سے مختلف زبانیں ہیں۔ ان میں اصلی اور نسلی امتیازات ہیں، جو ان کے مختلف الاصل ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور صاف صاف چغلی کھاتے ہیں کہ یہ زبانیں ایک گھرانے کی نہیں دو گھرانوں کی ہیں، ایک نسل کی نہیں دو نسل کی ہیں۔ گریرسن اور ہیورنلے نے جدید آریائی زبانوں کے دو گروہ بتائے ہیں۔ جو دراصل ہند آریائی زبانوں کی دو نسلیں ہیں، اندرونی اور بیرونی۔ شمال مغرب کی زبانوں میں سے مغربی پنجابی، سندھی، کشمیری بیرونی نسل کی ہیں اور مغربی ہندی، راجستھانی، گجراتی اندرونی نسل کی۔[1] گریرسن پنجابی کو اصل ونسل کے اعتبار سے بیرونی خاندان کا ایک فرد بتاتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مغربی پنجابی سے ملتی جلتی کوئی زبان اس علاقے میں رائج تھی جہاں آج پنجابی کا راج ہے۔ پنجاب کے مشرقی گوشہ سے لے کر مغربی گوشے تک یہ ملی جلی اور بڑی حد تک یکساں زبان بولی جا رہی تھی۔ کہ اچانک دوآبہ گنگ و جمن کے زیریں علاقے سے موجودہ ہندوستانی (اردو) کی کسی قدیم شکل نے ابھر کر پنجاب پر چھاپہ مارا اور قدیم مغربی پنجابی کو دریائے چناب کے نصف بالائی حصے سے پرے دھکیل کر پنجاب پر قابض ہو گئی۔ پنجابی قدیم ہندوستانی کی اس چیرہ دستی کی پیداوار ہے۔ یہ داستان گریرسن کے لفظوں میں سنیئے۔[2]

---

[1] ملاحظہ فرمایئے بمقالہ "کشمیری میں متصل ضمیریں" جرنل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۹۵ء صفحہ ۲۲۶

[2] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ نمبر ۶۱۲۔

"پنجاب کے مشرق میں مغربی ہندی کے کئی ہندوستانی روپ ہیں۔ جو دریائے جمنا کے دونوں طرف دوآب کے بالائی حصے میں بولے جاتے ہیں موجودہ لسانیاتی کیفیات و احوال سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی کے کسی قدیم روپ نے دھیرے دھیرے مشرقی پنجاب کی طرف قدم بڑھایا اور قدیم لہندا (مغربی پنجابی) زبان کو دریائے ستلج کے نصف بالائی حصہ تک دھکیل کر اس کی جگہ لے لی۔ یا یوں کہیے کہ اس پر چھا گئی ہندوستانی کا اثر صرف یہیں تک محدود نہیں رہا۔ اس کے آگے بھی اس نے قدم رکھا وہ بڑھتی رہی اور بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ صحرائے تھل نے حائل ہو کر اس کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔"

گریرسن کے اس قیاس کی بنیاد جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے، خود پنجابی زبان ہے وہ فرماتے ہیں[1] "پنجابی کی اصل و اساس پر نظر کریں۔ تو وہ بیرونی گروہ کی زبان لہندا موجودہ لہندا کی قریبی عزیز ہے۔ اس کی اوپری عمارت کو دیکھیں تو وہ مغربی ہندی (قدیم ہندوستانی) کا ایک ہجریا بولی معلوم ہوتی ہے۔"

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اساسی طور سے پنجابی اردو سے مختلف ہے۔ اوپر اردو پنجابی کے لسانی امتیازات کا خاکہ اسی غرض سے پیش کیا گیا۔ گریرسن کا نظریہ اس کا موید ہے۔ سوال یہ ہے کہ اردو اور پنجابی اصل و اساس کے لحاظ سے اگر ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو ان میں سے کوئی ایک دوسری کی اصل کیسے ہوئی؟ آئندہ بحث کو وضاحت کے لیے میں تین بنیادی نقطوں میں سمیٹ لینا چاہتا ہوں پھر اسی ترتیب سے ان پر بحث کروں گا

(الف) اردو اصل و نسل کے لحاظ سے پنجابی سے مختلف زبان ہے

(ب) اردو کا اختلافی سرمایہ پنجابی کے سرمایہ سے زیادہ قدیم ہے

(ج) اردو اور پنجابی کا مشترک سرمایہ ان زبانوں کو اپنی اپنی اصل سے ترکے میں ملا

---

[1] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۶۱۵

یا پنجابی نے قدیم ہندوستانی (اردو) سے مستعار لیا۔

ان میں سے پہلے نقطہ کو لیجئے۔ سب سے پہلے میں اردو زبان کی بنیادی خصوصیات کا ذکر کروں گا جن کا خاکہ اس مقالے کی ابتدائی تمہیدی سطروں میں پیش کیا گیا۔ اردو ان خصوصیات کی وجہ سے اردو بنی۔ یہ خصوصیات اسے اپنی اصل سے ورثے میں ملیں۔ اردو کی پاس پڑوس کی زبانوں میں سے کسی زبان میں کوئی خصوصیت پائی جائے تو وہ اردو کی سگی بہن ہو گی۔ اگر اردو کی بہن نہیں تو اس نے یہ خصوصیت اردو سے مستعار لی۔ ان میں سے پانچ جو درج ذیل ہیں اردو اور پنجابی میں مشترک ہیں۔

(۱) مذکر اسما صفات و افعال کے آخر کا 'ا'

(۲) 'نا' علامت مصدر

(۳) 'گا' علامت استقبال۔

(۴) غیر فاعلی حالت میں اسما مطلقہ کا 'ے'

(۵) 'نے' علامت آلی فاعل

باقی صفات صرف اردو میں ہیں۔ پنجابی ان سے ناآشنا ہے۔ اس کے علاوہ:۔

(۱) پنجابی دو یا دو سے زیادہ حرکات (علل) کا اجتماع گوارا کر لیتی ہے۔ اردو کو اس سے سخت نفرت ہے۔ جہاں دو حرکتیں یا دو علتیں کسی کلمے میں جمع ہوئیں اردو نے تسلیں (سندھی) یا ادغام کے ذریعے انہیں ایک دوسرے سے گلے ملا دیا جیسے کرؤں (کرنا ہوں) گھوڑی آں (گھوڑیاں) کرآجاوے (کرا جا دے) کری ات (کرے) چل آ (چلا) اردو کے مزاج کے مطابق بترتیب ان کا تلفظ اس طرح ہو گا۔ کروں (ا + ا = ا) گھوڑیاں (ی + آ = یا) کریا (ے + را = یا) کریت (ی + ا = ی) چلیا (ے + آ = یا)۔

(۲) فعل کے ساتھ متصل ضمیروں کا استعمال پنجابی کی فطرت ہے۔ یہ استعمال لہندا

میں زیادہ ہے اور پنجابی میں کم۔ تحلیلی زبان ہونے کی وجہ سے اردو متصل ضمیریں استعمال نہیں کرتی۔

(لہندا)	(پنجابی)	(اردو)
اکھے اس	آکھی۔اُس	اس نے کہا

آکھی۔اُس مرکب ہے 'آکھی' ۔ اور 'اس' سے (اکھیا = کہا۔ اس = اس نے)

(۳) پنجابی تالیفی زبان ہے۔اس کا فعل مستقبل تالیفی ہے۔فعل مجہول ۔ی ۔ کے اضافے سے بنا۔ اسما کی گردان میں سے ابتدائی ،ظرفی ،آلی تین حالتیں حرکات وصل میں تصرف کر کے حاصل کر لی گئیں۔ مثالیں اوپر درج ہو چکی ہیں۔

(۴) شروع کلمے میں پنجابی کا رجحان 'و' کی طرف ہے اردو کا 'ب' کی طرف۔ اس رجحان کے زیر اثر پنجابی نے فارسی 'ب' کو بھی 'و' سے بدل ڈالا۔

(پنجابی)	(اردو)
وچارہ	بیچارہ (بے + چارہ)
ورف	برف
وار	بار

(۵) کلمے کے شروع میں 'الف' کو 'ہ' سے بدلنا (ہور۔ ہک بجائے اور۔ ایک) پنجابی کی بیرونی فطرت کو بے نقاب کرتا ہے اور اسے اردو سے ممتاز بناتا ہے۔

(۶) پنجابی کی نمایاں ترین خصوصیت اس کا تشدیدی رجحان ہے۔ یہ رجحان شورسینی میں بھی تھا جسے ہندوستانی کی ماں بتایا جاتا ہے۔اردو کا میلان تخفیف و تسہیل کی طرف ہے اگرچہ اس میں چند کلمے مشدد بھی ہیں۔ پنجابی اس باب میں بہت سخت ہے۔ وہ ان کلمات کو بھی جو اصلاً مشدد نہیں درمیانی حرف علت گرا کر مشدد کر لیتی ہے اور اس میں دیسی یا دخیل اور اپنے یا پرائے کا فرق نہیں کرتی۔ مثلاً تین سنسکرت ترینی پر اکرت تین اصلاً

مشدد نہ تھا۔ پنجابی نے درمیان کی 'ی' گرا کر مشدد بنایا۔ ایک بھی مشدد نہیں، 'ی' گرا کر اسے بھی اک بنایا گیا۔ بزی (بعض جی) ملوم (معلوم) تکید (تاکید) مبوب (محبوب) میں 'ع'، 'ا'، 'ح' وغیرہ حروف پنجابی کے اسی رجحان طبع کی نذر ہوئے، سودا گرد سوداگر، بزاری (بازاری) کی کیفیت بھی یہی ہے۔

(۷) قدیم ہند آریائی 'س' پنجابی میں 'ہ' ہو جاتا ہے اور اگر آخر میں ہو تو گر جاتا ہے جیسے دا(دہ = دس)، بی (بیہ = بیس)، تی (تیہ = تیس) اچالی - ۳الی - ۱کی وغیرہ۔

(۸) 'س' کی مدد سے فعل مستقبل بنانا پنجابی کی فطرت ہے۔ اپبھرنش مگدھی اور مہاراشٹری میں یہ 'س'، 'ہ' سے بدل گیا تھا۔ پنجابی نے 'ہ' کی طرف مائل ہونے کے باوجود مستقبل کے 'س' کو برقرار رکھا۔

(۹) جب، کب، تب وغیرہ حروف اردو میں 'ت' سے ہیں پنجابی میں 'د' سے۔ جیسے جدوں، تدوں، کدوں یا جداں، تداں، کداں وغیرہ۔

یہ خصوصیات پنجابی کے ساتھ ہندکو میں بھی ہیں۔ ہندکو کے باب میں گریرسن کے حوالے سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ اصلاً اردو اور اس کی ہمسر دوسری بولیوں سے مختلف ہے۔ اردو اندرونی گروہ کی زبان ہے ہندکو بیرونی گروہ کی اور راجستھانی گجراتی گھرانے سے ہے۔ ہندکو سندھی اور مرہٹی گھرانے سے۔ اردو کے جب اور پنجابی جدوں کے ماخذ جدا جدا ہیں پنجابی جدوں، تدوں، کدوں بترتیب سنسکرت یدا، تدا، کدا سے ماخوذ ہیں اور اردو جب، تب، کب سنسکرت یاوت، تاوت، اور کاوت (یا کیئت) سے۔ پراکرت میں آخر سے 'ت' گری اور 'ی' 'ج' سے بدلی تو جاو۔ تاو۔ کاو ہوئے۔ ان سے جو، تو اور کو، پھر جب، تب، کب۔ دکھنی اردو میں 'جب' 'جو' تھا اور تب 'تو' لوگن (جب تک) تو لگن (تب تک) سب رس میں ہے جو لگن بشریت اس میں باقی ہے تو لگن اللہ کہنے کی مشتاقی ہے (صفحہ ۱۰۹) اردو تک اصل میں 'تو لگی' تھا۔ تو لگن = تو لگ = تب تک۔

تمگ یا تمک ہے۔ تک اس کے درمیانی حلقے ہیں۔ پنجابی تک کی جگہ تو ڈے۔ تائیں۔ لگ استعمال کرتی ہے۔

اردو 'دیا' کا ماخذ پنجابی 'دِتّہ' سے مختلف ہے۔ قدیم زبان میں جیسا کہ ڈاکٹر چٹرجی نے لکھا ہے[1] 'دا' (دینا) سے حالیہ تمام کے دو صیغے مستعمل تھے۔ دتہ (بتخفیف ت) اور دتّہ (بتشدید ت)، پہلا اردو 'دیا' کا ماخذ ہے اور دوسرا پنجابی 'دِتّہ' کا۔ 'د' کا کسرہ کلمہ اصل سے لیا گیا ہے۔ صیغہ واحد متکلم فعل حال کے لاحقہ (اں پنجابی اور 'وں' اردو) کا ماخذ بھی ایک نہیں۔ پنجابی لاحقہ پراکرت 'چلامِ' (میں چلوں) سے لیا گیا ہے۔ اور اردو اپ بھرنش 'چلئوں' سے۔ پنجابی 'چلیے' (ہم چلیں) کی اصل اردو 'چلیں' سے مختلف ہے۔ لاحقہ جمع پنجابی میں (غیر فاعلی حالت کے لئے) 'اں' ہے، اردو میں 'وں'، یہ بھی ایک دوسرے سے ماخوذ نہیں۔ ان میں سے ہر کلمے کی اصل دوسرے کلمے کی اصل سے جدا اور مختلف ہے۔ اگر اردو پنجابی سے ماخوذ ہوتی تو اہم بنیادی کلمے جو زبان کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں مختلف ماخذوں سے لئے جانے کی بجائے ایک دوسرے سے ماخوذ ہوتے اور اردو کلمہ پنجابی کلمے سے اتنا مختلف نہ ہوتا۔ اسی 'اسان' ضمیر و ضمیروں کی بابت ہیورنلے کی یہ رائے غور کے قابل ہے[2]

"پنجابی اور سندھی ضمیروں کا 'س'، پراکرت اور اپ بھرنش کی پیداوار نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی حلقی قسم کی پراکرت سے لیا گیا ہے۔ جو سنسکرت اسم 'کہ' 'مہ' یا 'م' کی بجائے 'س' سے بدل لیا کرتی تھی۔"

اب دوسرے نقطے کو لیجیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پنجابی میں ایسے عناصر بھی ہیں، جو

۱؎ بنگالی آغاز و ارتقاء ا صفحہ ۲

۲؎ گوڈین گرامر صفحہ ۲۸۰

ہند آریائی زبان کے ارتقا کو دیکھتے ہوئے زیادہ قدیم معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان سے پنجابی کی قدامت پسندی کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اردو اور پنجابی کے مختلف فیہ سرمایے میں سے اردو نے قدیم صیغوں یا ان کی قدیم شکلوں کو برقرار رکھ کر اس امر کا ثبوت پیش کیا ہے کہ اردو پنجابی سے ماخوذ نہیں۔

(۱) اردو فعل حال 'کہتا ہے، پڑھتا ہے'، کی 'ت' پنجابی 'کردا اے، پڑھدا اے' کی 'د' سے زیادہ قدیم ہے۔ یہ صیغے سنسکرت حالیہ ناتمام 'کرت'، 'پڑھت' سے ماخوذ ہیں۔ شورسینی پراکرت نے اول اول سنسکرت کی 'ت' کو 'د' سے بدلا۔ یہ صیغے پراکرت سے ہوتے ہوئے پنجابی میں آئے۔ پنجابی نے انھیں شورسینی سے لیا۔ اردو نے پراکرت کے کسی قدیم تر روپ سے جو 'ت' کو 'د' سے بدلنے کی روادار نہ تھی۔

(۲) اردو فعل معاون 'ہے' (واحد) اور 'ہیں' (جمع)، سنسکرت مادہ 'بھو' (ہونا) سے تراشے گئے ہیں یا 'اس' (ہونا) سے۔ پہلی صورت میں ان کی 'ہ' اصلی ہے جو 'ب' حذف ہو جانے کے بعد باقی بچ رہی۔ دوسری صورت میں وہ 'س' کا بدل ہے۔ پنجابی 'اے'، 'این' کی 'ہ' گر گئی۔ یہ کسی قدر بعد کی پیداوار ہیں۔

(۳) اوپر عرض کیا گیا کہ پنجابی نے اردو کے بہت سے الفاظ و کلمات کے 'س' کو 'ہ' سے بدل لیا۔ مولانا شیرانی مرحوم، اس بات کو نظر انداز کر کے کہ 'س' اصلی اور قدیم ہے فرماتے ہیں پنجابی کی 'ہ' اردو میں 'س' سے بدل جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل کلمات کا 'س'، 'ہ' سے زیادہ قدیم ہے۔ 'س' پہلے سے موجود تھا وہ 'ہ' کی جگہ کیسے لے سکتا تھا۔

(سنسکرت)	(پراکرت)	(اردو)	(پنجابی)
ورش	برس	برس	ورہ
وِنشت	بیسئی	بیس	ویہ
وِش	بِس	بس	وہ

شوشرا	سوسرا	سسرا	سوہرہ
دشل	دس	دہں	دہ

لہندا میں ضمائر (جمع حاضر) کی اضافی حالت میں 'س' تھا۔ پنجابی نے اپنے طبعی رجحان کے مطابق اسے بھی 'ڈ' سے بدل لیا۔ جیسے 'تاڈا' (لہندا)، 'تہاڈا' (پنجابی)۔

(۴) 'تمہارا' اور 'ہمارا' کی 'را' کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ پنجابی 'ڈا' سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پنجابی اور مستند لہندا میں آج بھی میرا اور تیرا مستعمل ہیں۔ لہندا کی شمالی اور جنوبی بولیوں نے 'میرا' کو 'میڈا' بنایا۔ پنجابی نے ہمارا اور تمہارا کو 'ساڈا' اور 'تہاڈا' یا 'تواڈا' کر لیا۔

(۵) 'کا' علامتِ اضافت کی جگہ پنجابی عام طور سے 'دا' استعمال کرتی ہے۔ گریرسن اور سد جیشور ورما کا بیان ہے کہ جنوبی لہندا میں 'کا' بھی دیکھا گیا ہے۔ گریرسن کہتے ہیں 'کا' 'دا' سے زیادہ قدیم ہے اور اغلب یہ ہے کہ وہ اس زبان میں بھی تھا جو کسی قدیم زمانے میں سارے پنجاب پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کی تائید مولانا شیرانی کے قول سے ہوتی ہے کہ پنجاب کے بعض شہروں اور بستیوں کا ایک جزو 'کا' ہے۔ اردو نے 'کا' برقرار رکھا۔ پنجابی نے ایک نیا کلمہ 'دا' وضع کر لیا۔

(۶) 'یاراں' پنجابی کے عام مزاج کے خلاف ہے۔ اس کے شروع میں 'ی' ہے اور میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ پنجابی اپنے کلمات کی ابتدا 'ی' سے نہیں کرتی۔ پنجابی نے غالباً یہ کلمہ اردو سے لیا[1]۔ سنسکرت میں یہ اکادش (ایک + دش) تھا۔ پراکرت نے 'ک' کو 'گ' سے بدلا۔ 'د' پہلے ہی 'ڑ' کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ اس سے 'اگارہ' بنا۔ بنگلہ اور اڑیا میں اس کی شکل یہی ہے۔ اردو نے 'گ' کے بعد 'ی' بڑھا کر 'اگیارہ' بنا لیا جو الف ساقط ہونے کے بعد 'گیارہ' رہا۔ پنجابی کے سامنے دو راہیں تھیں۔ یا تو وہ اگارہ اختیار کرتی یا

---

[1] گوڈین گرامر صفحہ ۲۵۰

مہاراشٹری آرہ (بحذف ک) اس نے بقول ڈاکٹر سیونلے[1] ایک طرف 'آرہ' یا اور دوسری طرف 'باراں'۔ پہلا اس کے مزاج کے مطابق تھا۔ اس کا امکان کم ہے کہ اس نے سندھی کی تقلید میں 'آرہ' کے دوسرے الف کو الف اول کے زیر کی مناسبت سے ی بنا لیا اس لئے کہ پنجابی عام طور سے دو حرکتوں یا علتوں کا اجتماع گوارا کر لیتی ہے اب صرف یہی ایک صورت رہ جاتی ہے کہ گیارہ کا گ گرا تو یاراں ہوا۔ باراں (بارہ) کے شروع کی 'د' بھی گر چکی ہے۔

اب میں اردو اور پنجابی کے مشترک سرمایہ کو لیتا ہوں۔ یہ سرمایہ دو قسم کا ہے۔ ایک وہ ہے جس کا ذکر مولانا شیرانی کرتے ہیں۔ مولانا نے اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا کہ یہ سرمایہ پنجابی کا ہے۔ اردو نے پنجابی سے لیا۔ پنجابی بھی تو آخر کسی قدیم زبان سے ارتقا پائی ہے۔ اگر یہ سرمایہ پنجابی کا ہے تو اسے اپنی اصل یا ماخذ سے ملا ہوگا۔ کیا اردو اس قدیم زبان سے ترقی پا کر نہیں بن سکتی؟ کیا یہ سرمایہ پنجابی کی طرح اردو کو اس زبان سے ترکے میں نہیں مل سکتا؟ جب تک یہ طے نہ ہو کہ یہ تمام سرمایہ جو اردو اور پنجابی کے مابین مشترک ہے اردو نے پنجابی سے لیا خود اردو کے پاس نہ تھا۔ اس وقت تک مولانا شیرانی مرحوم کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا میں اس سرمایے کو نہ اردو کی ملکیت سمجھتا ہوں نہ پنجابی کی۔ میرے خیال میں یہ ان زبانوں کو ان کی اصل سے ترکے میں ملا۔ اس پر اردو کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا پنجابی کا اس کیلئے کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں۔ پراکرت اور اپ بھرنش کا تاریخی مطالعہ کافی ہے یہ سرمایہ اپنی موجودہ شکل میں یا کسی قدر بدلے ہوئے روپ میں جستجو کرنے والے کو پراکرت یا اپ بھرنش میں دستیاب ہو سکتا ہے۔ مولانا شیرانی مرحوم کی بحث کا کمزور پہلو یہ ہے کہ اس میں پنجابی اور اردو کے ادوار کے ارتقائی دور کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جب تک زبان کی پوری تاریخ سامنے نہ ہو اس کا کسی دوسری زبان سے رشتہ دریافت کرنا ناممکن ہے۔

لے سدھیشور ورما بھی اسے دخیل بتلاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سنہ ۱۹۲۰ء ص ۸۳

مشترک سرمایے کی دوسری قسم کا ذکر میں اوپر کی سطروں میں کر چکا ہوں۔ یہ سرمایہ اُردو کی امتیازی خصوصیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں سے ذیل کی صفات پنجابی نے اردو سے لیں :-

(۱) 'گا' علامتِ استقبال اردو ہے۔ لہندا، گجراتی اور مارواڑی کی طرح پنجابی قدیم سے 'سی' لگا کر فعل مستقبل بناتی رہی ہے۔ قدیم پنجابی کے نمونے آدگرنتھ میں ملتے ہیں۔ ان میں گا کے ساتھ 'سی' بھی استعمال ہوا ہے۔ مقبل کی نظم ہیر رانجھا میں جو بقول بنارسی داس جین محمد شاہ کے عہد میں لکھی گئی، عام طور سے 'سی' دیکھا گیا ہے۔ صرف ایک صفحے پر حسب ذیل آٹھ صیغے ہیں۔

جاؤساں۔ بہاؤساں۔ بجاؤساں۔ پلاؤساں۔ لیاؤساں۔ پاؤساں۔ آؤساں۔ سناؤساں مقبل نے فارسی و عربی مصادر پر بھی 'سی' داخل کیا ہے۔

جے توں جوگی نوں سد کے کریں راضی صحت بخش سی رب اللہ تینوں
ہیر کھوہ کے دیہہ توں راوے نوں مقبل بخش سی رب گناہ تینوں

گریرسن وغیرہ علمائے لسانیات پنجابی کو بیرونی گروہ کی زبان بتاتے ہیں۔ ان زبانوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اعرابی اور تعریفی لاحقے اصل کلمے سے جدا نہیں ہوتے وہ اس کا ایک جزو ہوتے ہیں۔ لہندا کی طرح فعل مستقبل کو اتصالی لاحقے 'سی' کی مدد سے گردانا پنجابی کی فطرت ہے۔ 'گا' انفصالی لاحقہ ہے۔ یہ اس نے اردو کے قدیم روپ سے مستعار لیا 'گا' نے آہستہ آہستہ 'سی' کو نکال باہر کیا۔ برج پر بحث کرتے ہوئے میں لکھ آیا ہوں کہ کسی زبان میں دو دوہرے صیغے نہیں ہوتے الا یہ کہ ان میں سے ایک دوسری زبان سے لیا گیا ہو۔ اس قاعدے سے بھی 'سی' اور 'گا' دونوں پنجابی نہ ہوں گے۔ پنجابی کی فطرت کا تقاضا ہے کہ 'سی' اس کا ہو۔ اور 'گا' کسی دوسری زبان کا اور اردو کے سوا کوئی زبان نہیں جس کے دامن میں اسے باندھا جا سکے۔

(۱۲) 'نا' علامت مصدر اگرچہ پنجابی میں بکثرت مستعمل ہے لیکن اس کے کئی قرینے ہیں کہ یہ پنجابی نہیں۔ ایک تو پنجابی میں 'نا' کے پہلو بہ پہلو 'ن' بھی ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ دوہرے لاحقوں میں سے صرف ایک اصلی یا ذاتی ہوتا ہے۔ دوسرے تصریف کی صورت میں پنجابی 'نا' کی جگہ 'ن' استعمال کرتی ہے۔ جیسے:-

(پنجابی)	(اردو)
کرن والا	کرنے والا
کہن لگیا	کہنے لگا
مارن لگیا	مارنے لگا۔
بولن نہ پایا	بولنے نہ پایا۔

اگر 'نا' پنجابی ہوتا تو اردو کی طرح بصورتِ تصریف اس کا استعمال عام ہوتا۔ پنجابی نے غالباً 'ن' پر الف بعد میں الف پر ختم ہونے والے اسما کو دیکھ کر اضافہ کیا یا اردو کی دیکھا دیکھی 'ن' کو 'نا' بنایا۔ مولانا شیرانی پنجابی سے 'نا' کی تصریف کی جو مثالیں پیش فرماتے ہیں وہ شاذ ہیں اور ان پر اردو کا اثر بھی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں: "پنجابی میں زیادہ رائج طریقہ یہ ہے کہ مصدر کے آخری الف کو اسی مطلب سے گرا دیا جاتا ہے[1]۔"

(۱۳) مذکر اسماء و صفات کے آخری حرف کو بیمز نے 'کسی قدر پنجابی' قرار دے کر لکھا تھا کہ اردو نے اسے پنجابی سے لیا[2]۔ گریرسن کی رائے میں[3] اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں یہ بیرونی گروہ کی زبانوں سے آیا۔ ہیم چندر کے مندرجہ ذیل مصرعے میں:-

ڈھولا مَیں تُہَم وارِیا مَا کُرُ دیہا ماٹو۔

(دولھا میں تم پر واری زیادہ نخرے نہ کرو)

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۱۲۵

[2] گوڑین گرامر مقدمہ صفحہ ۷

[3] "مبدا آریائی بولیاں" بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز جلد ۱ حاشیہ صفحہ ۷۳۔

ڈھولا (دولہا)، وادا (داری)، دیہا (طویل)۔ زیادہ تر اسما و صفات 'الف' پر ختم ہوتے ہیں۔ شیام سندر داس لکھتے ہیں "معلوم نہیں یہ پیشاچی اپ بھرنش کا روپ ہے یا کسی اور کا، ہیم چندر نے اس کا ذکر نہیں کیا لیکن پنجابی میں 'ے ا' پر ختم ہونے والے روپ ملتے ہیں اس لئے ممکن ہے یہ کسی پیشاچی اپ بھرنش کا روپ ہو"[1]

اس سلسلے میں کئی باتیں غور کے قابل ہیں۔ گریرسن نے 'الف' کو بیرونی گروہ کی زبانوں سے ماخوذ بتایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیرونی گروہ کی زبانوں میں سے مرہٹی اور بنگلا میں بھی یہ الف موجود ہے لیکن اردو اور پنجابی میں عام ہے۔ اسما و صفات و افعال کے حروف ہر جگہ نظر آتا ہے۔ بنگلا کے چند اسما ایسے ہیں جو الف پر ختم ہوتے ہیں۔ عام طور سے بنگلا اسما، صفات و افعال کے آخر میں 'و' یا 'ے' ہوتا ہے جیسے

(بنگلا)	(اردو)
بھالو	بھلا
چلو	چلا
جابو	جاؤں گا
چھلو	تھا
چھیلے	چھیلا

سندھی بیرونی طبقے کی زبان ہے۔ اس کے باوجود اس کے مذکر اسما 'و' پر ختم ہوتے ہیں جیسے گھوڑو، بھلو، گھوڑو۔ شیام سندر داس کا قیاس کہ 'ے ا' پنجابی میں ہے اسی لئے یہ پیشاچی اپ بھرنش کا روپ ہے اس صورت میں ٹھیک تھا کہ یہ 'ے' کشمیری، شنا وغیرہ جدید پیشاچی بولیوں میں بھی ہوتا۔ پشتو ہر چند ان میں سے نہیں لیکن ان میں محدود و محصور ہونے کے باعث ان سے قریب ہے۔ پنجابی سے زیادہ

---

[1] ہندی بھاشا اور ساہتیہ۔ صفحہ ۱۴۲

اسے ان کا اثر لینا چاہیئے۔

ہر چند کہیں کہیں "ے" اسما کے یہاں مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ جیسے لگ آ (پشتو) لگ آ (پنجابی) لگا (اردو) لیکن عام طور سے اس کے کلمات "ے" پر ختم ہوئے ہیں: جیسے تلے (پشتو) تلا (اردو) سندھی میں یہ لفظ تلو ہے۔

مندرجہ بالا مصرعہ کے علاوہ ہیم چندر کے یہاں ذیل کا مصرعہ بھی ملتا ہے۔

بھلا ہوا جو مارآ بہن مہارا کنت

اس کی تشریح و تحلیل اردو میں اس طرح ہو گی۔ بھلا (بھلا) ہوا (ہوا) جُ (جو) مارآ (مارا) بہن (بہن) مہارا (میرا) کنتُ (کانت = شوہر) اس میں بھلا، ہوا، مارآ، مہارا وغیرہ کلمے "ا" پر ختم ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر ہیورنلے کا بیان ہے کہ مشہور قواعد نویس کرمدیشور نے ماگدھی پراکرت 'شالے' (ہندی سیار) کا ایک روپ 'شالا' بتایا ہے یہ 'ا' ماگدھی میں اسما کی ندائیہ حالت کی علامت تھا۔ ہیورنلے کے خیال میں بعد میں اسے توسیع دے دی گئی اور جدید زبانوں میں عام طور سے یہ اسما کی فاعلی حالت میں برتا جانے لگا۔[1]

بہر حال یہ 'ا' ماگدھی پراکرت سے لیا گیا ہو یا پیشاچی سے، بیرونی گروہ کی زبانوں کا ہو یا اندرونی گروہ کی زبانوں کا، اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ پنجابی نہیں۔ اردو بھی ہے اور پنجابی بھی ——— دونوں سے اس کا برابر کا تعلق ہے۔ اردو اور پنجابی میں اس کے استعمال کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ان زبانوں میں یہ کہیں باہر سے نہیں آیا۔ انہیں اپنی اصل سے ترکے میں ملا ہے۔

(۴) "نے" کے باب میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پنجابی نہیں۔ قدیم پنجابی میں اس کا استعمال نہ تھا۔ سدھیشور ورما نے جنم ساکھی سے حسب ذیل مثالیں اس کی تائید میں پیش کی ہیں۔ اس دِتا (اس نے دیا)، تدھ کیتی ہاں (تو نے کیا ہے)، مردانے

۱؎ گوڈین گرامر صفحات ۳۹، ۴۰

گھنڈی کھانڈی (مردانہ نے گھبرانا شروع کیا) سدھیشور کا بیان ہے کہ کھوئی وغیرہ شمالی بولیوں میں 'نے' نہیں دیکھا گیا[1]۔ مسٹر ٹی بومفورڈ (T-BOMFORD) نے جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی اشاعت ۱۸۹۵ء میں مغربی پنجابی کی ایک مختصر گرامر شائع کی تھی اس میں وہ لکھتے ہیں "اردو میں فعل متعدی کی صورت میں 'نے' ضرور ہوگا۔ جیسے میں نے فرمایا (فرمایا کی ایک ہے رہی!) لیکن ملتانی کے باب میں اہلِ علم کا اختلاف ہے بعض لکھتے ہیں۔ میں فرمایا کافی ہے۔ سیرام پور کی تبلیغی جماعت کے شائع کردہ (۱۸۱۹ء) پنجابی ترجمے میں 'نے' موجود ہے لیکن اضلاع مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خاں اور ریاست بہاولپور میں اس کا استعمال بہت کم دیکھا گیا ہے[2]۔" پنجابی میں 'نے' کے ناہموار اور غیر استوار استعمال کو دیکھ کر شاید ڈاکٹر ہیورنلے نے مارواڑی لاحقہ مفعول 'نیں' سے نکال کر اس کا جوڑ پنجابی 'نوں' (کو) سے لگایا[3]۔ یہ کھلا ہوا تکلف ہے، اور اس سے زیادہ تکلف ان کے اس دلچسپ قیاس میں ہے۔ "اردو نے دیکھا کہ پاس پڑوس کی بولیوں میں دو مختلف لاحقے مستعمل ہیں 'کو' یا 'کو' برج میں اور 'نیں' یا 'نے' مارواڑی میں تو اس نے 'نے' کو فاعل (آلی) کے لیے چن لیا۔ اور 'کو' کو مفعول (اول و ثانی) کے لیے۔ اس طرح اردو اس خلط و اشتباہ سے محفوظ رہی جو فاعلی، مفعولی اور اضافی حالتوں میں 'نے' کے استعمال سے گجراتی وغیرہ زبانوں میں راہ پاگیا تھا[4]۔"

ڈاکٹر گریرسن 'نے' کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکے۔ انہیں اس میں شبہ ہی رہا کہ یہ اردو میں مرہٹی زبان سے آیا یا مضافاتِ دہلی کی زبان سے۔ ویسے ان کا رجحان پنجابی کی طرف ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ "ادبی ہندوستانی کا 'نے' دو آبہ کے بالائی حصے

---

[1] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۳۶ء ۱۱۳

[2] صفحہ ۲۹۰

[3] گوڈین گرامر مقدمہ صفحہ ۷

[4] گوڈین گرامر صفحہ ۲۱۹

کی ہندوستانی بول چال میں بھی ہے لیکن وہ پنجابی سے مستعار معلوم ہوتا ہے جہاں اس کا استعمال 'نہیں' کی شکل میں، باقاعدگی اور نظم کے ساتھ ہوا ہے۔ اس نظم و باقاعدگی کا ذکر سدھیشور اور بومفورڈ کے حوالے سے میں اوپر کی سطروں میں کر چکا ہوں۔ مقبل کے ہیر رانجھے کے دو مصرعے ایک ہی مقام سے منتخب کر کے لکھے جاتے ہیں۔ ان میں بھی 'نے' نہیں۔

راجے عدلی نوں آکھیا ہیر رانجھے کوئی سچ پچھان کے مار سانوں

مقبل جس دکھایا ہے تہندیاں نوں ہووے اس دے نال تنول میاں

مزید تفصیل میرے مقالے "'نے' کی سرگزشت" (مطبوعہ رسالہ اردو اکتوبر ۶۹۵ء) میں ملاحظہ ہو۔

(۵) اسمائے مطلقہ کی غیر فاعلی حالت کا 'س' اردو اور پنجابی دونوں میں یکساں طور سے استعمال ہوا ہے لیکن اصل میں وہ اردو ہے۔ پنجابی قدیم فطری رجحان کے زیر اثر 'س' کو 'ہ' سے بدل لیتی ہے اس 'س' پر بھی اس نے ہاتھ صاف کیا اور 'اس' کو 'اہ' اور 'جس' کو 'جیہ' بنایا۔ جس۔ کس۔ تس کے پہلو بہ پہلو پنجابی میں جیہ، کیہ، تیہ بھی مستعمل ہیں لیکن عام طور سے پنجابی 'س' ہی استعمال کرتی ہے۔ یہ اردو کا اثر ہے اور یہی اس امر کا ثبوت بھی ہے کہ یہ 'س' پنجابی میں اردو سے لیا گیا۔ اگر یہ اصلاً پنجابی ہوتا تو "ہ" کی دستبرد سے محفوظ نہ رہتا اور بقول شخصے "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" یہ 'س' کبھی کا "ہ" ہو گیا ہوتا۔ فعل مستقبل کا 'س' اس تعریف سے بچ رہا اس لئے کہ گجراتی، مارواڑی وغیرہ پاس پڑوس کی بولیوں میں یہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ پنجابی کے عام رجحان کے مطابق 'س' مشدد ہونا چاہیئے۔ سنسکرت میں یہ 'سی' تھا۔ اور پراکرت میں 'سس'۔ پنجابی پراکرت کے مشدد حروف میں تخفیف روا نہیں رکھتی اور کان کو کن اور ہاتھ کو ہتھ کہتی ہے کس کا کس اور جس کا جس اس نے کیسا گوارا کیا؟ وہ ان پر اپنا عمل تشدید کیوں جاری نہ کر سکی؟

برج میں یہ کلمے اس کے مزاج کے مطابق 'جاسو' اور 'تاسو' ہیں۔ یہاں ان پر عمل تخفیف (بحذف س، وتسہیل (باشباع حرکت حرف اول) جاری ہوا۔ آخر میں جس جاس ہے اور تس تاس۔ جیسے؎

تاس راج سمیپم۔ رہوں نٹ ودیا اُچارم

(اس راجہ کے قریب علم رقص سیکھنے کے لئے رہتا ہوں)

لہندا میں 'س' نہیں ملتا، پنجابی اردو کے قریب تھی اس لئے وہاں تو پہنچ گئی لہندا کے حدود تک اس کی رسائی نہ ہو سکی۔

پنجابی اور اردو کے مختلف فیہ سرمایہ میں سے اردو سرمایہ کی قدامت اردو کو پنجابی سے مختلف زبان ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس پر مشترک سرمایہ کی یہ کیفیت ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ اردو سے پنجابی میں منتقل ہوا۔ اس کے بعد پنجابی کو اردو کی اصل قرار دینا کہاں تک صحیح ہے اس کا فیصلہ خود قارئین فرمائیں۔ گریرسن پنجابی کو ایک طرح کی رلی ملی زبان بتاتے ہیں جس کا ایک اہم حصہ قدیم اردو سے ماخوذ ہے۔ ان کے الفاظ غور کے قابل ہیں؎:

"پنجابی ایک ایسی زبان ہے جسے مغربی ہندی اور لہندا و سندھی کے درمیان کی ایک کڑی کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک رلی ملی اور مخلوط زبان ہے۔"

۱؎ بحوالہ گوڈین گرامر حاشیہ صفحہ ۴۴

۲؎ بلیٹن، سکول آف اورینٹل اسٹڈیز جلد اول صفحہ ۵۔

(۵)

"مولد و منشا"

مولانا شیرانی فرماتے ہیں[۱]:

"جس زبان سے اردو نے ارتقا پاتی ہے نہ وہ برج ہے اور نہ قنوجی بلکہ وہ زبان ہے جو دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔"

ڈاکٹر سدھیشور ورما لکھتے ہیں[۲]:

"ہندی (اردو) دہلی اور میرٹھ کے قرب و جوار میں بولی جاتی تھی۔"

رام بابو سکسینہ کا ارشاد ہے[۳]:

"اردو اصل و ماخذ کے اعتبار سے مغربی ہندی کی شاخ ہے جو دہلی اور میرٹھ کے نواح میں صدیوں تک بولی جاتی رہی ہے۔ اور جو شورسینی پراکرت سے ترقی پاکر بنی ہے۔"

مشہور ماہرِ لسانیات ڈاکٹر گریرسن کی تحقیق کے مطابق[۴]:

---

[۱] پنجاب میں اردو (مقدمہ) صفحہ ۳

[۲] ہند آریائی زبانیں صفحہ ۲

[۳] تاریخ ادب اردو (مقدمہ) صفحہ ۱

[۴] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج اول صفحہ ۱

"ہندوستانی قدیم ہندی کی شاخ ہے۔ یہ (ہندوستانی) دوآبہ گنگ و جمن کے بالائی حصے کی بولی ہے جو مغلوں کے ابتدائی عہد میں دلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھی۔ مغل فوجیں اسے ہندوستان کے گوشے گوشے میں اپنے ساتھ لے کر گئیں۔"

قدیم مغربی ہندی کے باب میں چٹرجی فرماتے ہیں ۱؎:-

"مغربی ہندی کی پانچ بولیاں ہیں۔ ایک طرف برج بھاکا، قنوجی اور بندیلی ہے۔ دوسری طرف بول چال کی ہندوستانی (میرٹھ قسمت روہیل کھنڈ اور ضلع انبالہ) بانگرو یا ہریانی (دہلی، روہتک، حصار، پٹیالہ)"

برج بھاکا، بندیلی، قنوجی۔ ہندوستانی میں فرق کرنے اور یہ دکھلانے کے بعد کہ ہندوستانی اور ہریانی "و" والی بولیاں ہیں اور برج، قنوجی، بندیلی "یا" والی، چٹرجی ارشاد فرماتے ہیں ۲؎:-

"نئی زبان کی بنیاد جو دہلی میں بڑھی اور پروان چڑھی "و" والی بولی پر قائم ہے۔ اس سوال پر مزید بحث غیر ضروری معلوم ہوتی ہے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ شمالی ہند کی زبان کا ایک نیا روپ، جس کی بنیادیں مشرقی پنجاب اور یوپی کے مغربی اضلاع کی بولیوں پر استوار ہوئی تھیں، دہلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد ابھر کر نمایاں ہوا۔"

شمالی ہند کی زبان کا یہ نیا روپ اردو ہے۔ چٹرجی اس کی بنیاد ہریانی اور یوپی کے مغربی اضلاع کی ہندوستانی پر رکھتے ہیں۔ ہریانی ہندوستانی سے الگ زبان نہیں وہ اس کی ایک شاخ ہے۔ مولانا شیرانی فرماتے ہیں ۳؎:-

"ہریانی زبان دراصل ایک قسم کی اردو ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں شاید

۱؎ انڈو آرین اینڈ ہندی اول صفحہ ۱۷۱
۲؎ انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۷۱ ۳؎ پنجاب میں اردو (مقدمہ) صفحہ ۱۱

اردو سے اتنی مختلف نہ تھی جس قدر کہ آج دیکھی جاتی ہے۔ کیونکہ زمانۂ ما بعد میں، جب کہ ہریانی اپنی اصلی حالت پر قائم رہی اُردو میں دہلی کے محاورے اور شعرا کے تصرفات کی بنا پر کثیر تغیرات واقع ہوگئے۔ موجودہ اردو اسی اصلاح شدہ شکل کا نام ہے۔[1]

گریرسن ہریانی کو ایک طرح کی مخلوط زبان بتلاتے ہیں[2]۔

یہ ملی جلی بولی ہے۔ اس میں کچھ حصہ ہندی (ہندوستانی) کا ہے۔ کچھ پنجابی کا اور کچھ راجستھانی کا۔

ملی جلی زبان پر اردو کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی، اردو ہندوستانی سے ترقی پا کر بنی جو دہلی میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ جب مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے تو ہندوستانی دہلی کے بازاروں میں بول چال کی حیثیت سے رائج تھی۔ امیر خسرو، ابوالفضل، شیخ بہاؤالدین باجن نے اسے دہلوی کہا۔ ہندو اہل علم عام طور سے برج، قنوجی بندیلی وغیرہ بولیوں سے امتیاز کے لیے سوا اس وقت پڑی بولی کہلاتی تھیں کھڑی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جب یہ زبان ترقی پا کر آگے بڑھی مسلمانوں کی سرپرستی میں پروان چڑھی ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تو ہندوستانی کہلائی۔ زبان بنیادی طور سے وہی رہی جو آج ہے۔ اس کے نام ایک سے زیادہ تجویز ہوئے۔ ناموں کی کثرت یا تنوع کی وجہ سے اہل علم کو اس کی شخصیت میں شبہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے میں نے شروع میں اس کی تعیین مناسب سمجھی اور روش عام سے ہٹ کر بحث کا یہ انداز اختیار کیا کہ موجودہ اردو کو لے کر سوال اٹھایا کہ اس کا ماخذ کیا ہے؟ یہ کب پیدا ہوئی اور کس مقام سے اس نے نشوونما پایا؟

ہری اودھ فرماتے ہیں[3]

پشچمی (مغربی) ہندی کا ایک روپ وہ شدھ (خالص) ہندی (اردو) بھاشا ہے

---

[1] بلٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۱ صفحہ ۵۳

[2] ہندی بھاشا اور اس کے ساہتیہ کا وکاس صفحہ ۵۷

جو میرٹھ اور دہلی کے آس پاس بولی جاتی ہے۔ اس کو ہندوستانی کہتے ہیں۔"

ان اقوال سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے :-

(۱) اردو، ہندی، ہندوستانی، دہلوی ایک زبان کے کئی نام ہیں۔

(۲) یہ زبان کھڑی بولی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

(۳) کھڑی دہلی اور میرٹھ کی زبان ہے جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے دہلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھی۔

(۴) کھڑی بولی مغربی ہندی کی شاخ ہے۔

(۵) مغربی ہندی شورسینی اپ بھرنش اور پراکرت سے نکلی جو کبھی دوآبۂ گنگ وجمن کے زرخیز علاقے میں بولی جاتی تھی۔

وضاحت کے لئے ان نتائج کو اس طرح پیش کریں تو بہتر ہے۔

اردو = ہندوستانی = مغربی اپ بھرنش = شورسینی پراکرت = قدیم پراکرت۔

ہندوستانی کے مولد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ سب متفقہ طور سے اسے دہلی اور میرٹھ کی زبان بتاتے ہیں۔ اردو اس کی ادبی شکل ہے۔ اس زبان کو یہ نام بعد میں اس وقت دیا گیا جب مسلمانوں کی سرپرستی میں بول چال کی زبان سے ترقی کر کے اس نے ادب و شعر کی زبان کا درجہ پایا۔ مسلمانوں کے ہمرکاب یہ زبان دہلی سے نکل کر ملک کے دور دراز حصوں تک پہنچی۔ مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ اس کا اقتدار بڑھا اور اس کی حدیں وسیع ہوئیں۔ لوگ بھول گئے کہ کبھی یہ زبان ایک چھوٹے سے علاقے میں محدود تھی۔ اس سے پہلے 'پالی' کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اردو کی طرح وہ بھی اپنے مولد سے نکل کر برصغیر کے گوشے گوشے میں پہنچی اور ایک عالم ملکی اور مذہبی زبان کی حیثیت سے سارے ملک پر چھا گئی۔

ڈاکٹر چٹرجی اردو کے مولد و مسکن کے باب میں اہلِ علم کے اختلافات کا ذکر کرتے

ہوئے لکھتے ہیں۔ پالی کتاب میں آج تک طے نہ ہو سکا کہ وہ بہار کی زبان ہے یا اوجی دو آبے کی۔

اردو میرٹھ اور دہلی کی زبان ہے اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں مولانا محمود خاں شیرانی کو بھی ماننا پڑا کہ اردو جس زبان سے ارتقا پاتی ہے۔ وہ دہلی اور میرٹھ، کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ زبان کا مولد وہی ہوتا ہے۔ جہاں وہ بلا شرکت غیرے بولی جائے پنجاب، اودھ، دکن، بہار، گجرات، بمبئی، وسط ہند جہاں کہیں اردو کا سکہ چلتا ہے[1] اردو کے پہلو بہ پہلو دوسری زبانیں بھی ہیں۔ کہیں اردو تہذیبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے بول چال کی زبانیں اور ہیں کہیں اردو کے ساتھ دوسری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ کہیں شہر کی زبان اردو ہے۔ دیہات کے باشندے مقامی زبان بولتے ہیں لیکن یوپی کے مغربی اضلاع میں اردو کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں۔ صرف اردو ہے جو شہروں اور دیہاتوں میں عام طور سے بولی جاتی ہے۔ یوپی کے مغربی اضلاع میں ہندو مسلمان سب اردو بولتے ہیں۔ وہ ہندو کی زبان بھی ہے اور مسلمان کی بھی۔ دوسرے مقامات میں وہ صرف مسلمان کی زبان ہے۔ مسلمان اردو بولتے ہیں۔ ہندو مقامی زبان استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً تامل کے علاقے میں مسلمانوں کے گھروں میں اردو بولی جاتی ہے۔ بازار اور ہاٹ میں بدستور تامل کا سکہ چلتا ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی میں یا اس سے کچھ پہلے اردو کے خط و خال ابھرے۔ یا یوں کہیے، اردو نے قدیم مغربی ہندی سے ترقی پاکر موجودہ روپ اختیار کیا۔ قدیم مغربی ہندی کون سی زبان ہے اور اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس کا جواب آسان نہیں۔ اردو، برج، ہریانی، قنوجی، بندیلی آج جہاں بولی جاتی ہیں دسویں صدی عیسوی میں یہ پورا علاقہ کسی ایک زبان کے تصرف میں تھا۔ یہ زبان ان بولیوں کے حدود میں رائج تھی۔ اگرچہ یہ کہنا

[1] ملاحظہ فرمایئے خطبہ صدارت کل ہند اورینٹل [?] کانفرنس ۱۹۳۰ء

مشکل ہے کہ اس زبان میں کسی قسم کا اختلاف نہ تھا۔ ہر لحاظ سے وہ واحد اور یکساں تھی لیکن اس میں اتنا احساس حد تک کا اختلاف نہ تھا جتنا کہ آج ان بولیوں میں ہے جو اس زبان سے متفرع ہوئیں۔ یہ زبان بدلتی رہی، اس کے اختلافات جو کسی زمانے میں معمولی اور غیر اہم تھے شدید سے شدید تر ہوتے رہے اور گیارہویں صدی عیسوی کے آتے آتے اتنے نمایاں ہو گئے کہ وہ پانچ بولیوں میں بٹ گئی۔ اس قدیم زبان کو جو دسویں صدی عیسوی میں اردو، اور اس کی ہمسر بولیوں میں منقسم ہوئی قدیم ہندی کہتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے پاس اس زبان کی کوئی تحریری دستاویز نہیں جس کی مدد سے ہم بتا سکیں کہ اس کی لسانی خصوصیات کیا ہیں اور یہ اپنی پانچ بولیوں میں سے کس سے زیادہ قریب ہے۔ عام طور سے چند بردائی کی کتاب "پرتھی راج راسو" کی زبان کو قدیم ہندی بتایا جاتا ہے اس میں کئی الجھنیں ہیں۔ ایک تو راسو پوری چند کوی کی نہیں۔ اس کے بہت سے حصے پندرھویں اور سولھویں صدی کی تصنیف ہیں، دوسرے اس کی زبان خالص ہندی نہیں۔ اس میں پنجابی، راجستھانی، مغربی اپ بھرنش کی آمیزش بھی ہے تیسرے یہ وہ زبان نہیں جو کبھی برج اردو وغیرہ میں مشترک تھی۔ اور جس سے یہ بولیاں متفرع ہوئیں۔ یہ قدیم برج ہے۔ برج کی طرح اس کے اسما 'ے۔ و' پر ختم ہوتے ہیں۔ اور مصطفہ ہے۔ یہ وہ 'ے' اور 'و' کی جگہ 'ے' اور 'د' استعمال کرتی ہے۔ 'تے' اس میں 'سے' کے لئے استعمال ہوا ہے۔ خیام سندر داس کی رائے میں[1]۔ "پرتھوی راج راسو میں برج کے ڈھانچ کا بہت کچھ آبھاس ہے" ڈاکٹر گریرسن راسو کی زبان قدیم برج بتاتے ہیں[2]۔

ڈاکٹر چٹرجی لکھتے ہیں[3]:۔

---

[1] ہندی بھاشا اور اس کا ساہتیہ صفحہ ۲۔

[2] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول

[3] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۷۶

"اس میں بڑی حد تک شبہ کی گنجائش ہے کہ اس نظم (راسو) کے مضامین کچھ یا واقعی اور اس کی زبان اصلی یا حقیقی ہے یعنی بارھویں صدی عیسوی کی زبان ہے جب اس نظم کا خالق اور اس کا ممدوح دونوں بقید حیات تھے۔ ہو سکتا ہے اس نظم کا کچھ حصہ چند بردائی کی تصنیف ہو لیکن اس کی زبان بڑی حد تک مسخ ہو گئی ہے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں[1]:

"راسو کی زبان زندہ — کسی صوبے میں یا کسی زمانے میں بولی جانے والی زبان نہیں — وہ ایک طرح کی خود ساختہ ادبی زبان ہے جس میں ایک سے زیادہ زبانوں کے، جو کبھی دہلی سے دور دراز مقامات میں بولی جاتی ہوں گی، بہت سے صیغے اور ان کے مختلف روپ شامل ہو گئے ہیں۔ اس کے اہم عناصر مغربی اپ بھرنش، قدیم مغربی ہندی، راجستھانی اور اس کی مختلف بولیوں اور قدیم پنجابی کے مختلف روپ ہیں جو ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔"

راسو کی زبان قدیم برج ہے یا خود ساختہ مخلوط ادبی زبان، قدیم مغربی ہندی ہرگز نہیں جسے اردو یا ہندوستانی کی اصل بتایا جاتا ہے۔ جب تک مغربی ہندی کا اصل روپ سامنے نہ ہو، اس کے خط و خال متعین نہ ہوں، اس کی لسانی خصوصیات کی نشاندہی نہ کی جائے ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ گیارہویں صدی عیسوی میں مغربی ہندی دہلی اور میرٹھ کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ اردو اس سے ترقی پا کر بنی۔ میرے خیال میں قدیم مغربی ہندی کا تصور جیسا کہ میں اپنے تحقیقی مقالے میں[2] عرض کر چکا ہوں ایک طرح کی ذہنی تجرید یا منطقی ابداع ہے۔ دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں میں آج غیر معمولی شباہتیں دیکھ کر دانایانِ مغرب کو خیال ہوا کہ وہ ان کا متحد ماخذ قرار دیں چنانچہ مغربی ہندی کے نام سے ایک زبان فرض کر کے

[1] اُردو، آدی اینڈ ہندی صفحہ ۱۷۶

[2] اُردو زبان کا ارتقا باب سوم

انہوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ زبان گیارہویں صدی عیسوی میں ہریانی برج، کھڑی، قنوجی بندیلی کے وسیع و عریض علاقے میں بولی جاتی تھی یہ بولیاں اس زبان کی کوکھ سے پیدا ہوئیں۔ ڈاکٹر گریرسن ہندوستانی کو مغربی ہندی کی نمائندہ زبان قرار دیکر لکھتے ہیں، اس میں فعل کی صرف ایک گردان (مضارع) اور اسم کی صرف ایک اعرابی حالت (غیر فاعلی) ملتی ہے[1]۔

اردو اور پراکرت کی درمیانی کڑی اپ بھرنش ہے۔ اس لئے مغربی ہندی کو درمیان سے نکال کر یہ کہنا کہ اردو اپ بھرنش سے ارتقا پاکر وجود میں آئی زیادہ صحیح ہے۔ لیکن اپ بھرنش کسی ایک بولی کا نام نہیں۔ پراکرت دور کے بعد کی سبھی بولیاں جو بدل بدلا کر کچھ سے کچھ ہوئیں۔ اور درمیانی عہد کی پراکرتوں سے مختلف اور نئی زبانیں بنیں اپ بھرنش یا اپ بھرشٹ یعنی بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ کہلائیں۔ مشہور قواعد نویس مارکنڈے نے اپنی "پراکرت سروسو" میں کسی نامعلوم مصنف کے حوالے سے ستائیس اپ بھرنش شمار کرائی ہیں۔ لیکن وہ کہتا ہے اصل اپ بھرنش صرف تین ہیں۔ ناگر، اپ ناگر اور براچڈ۔ براچڈ سندھ میں بولی جاتی تھی۔ ناگر کے بارے میں گریرسن کا خیال ہے کہ وہ شورسینی یا مغربی اپ بھرنش ہے۔ یہ گجرات کی زبان تھی۔ ہیم چندر گجرات کا رہنے والا تھا۔ اس نے مغربی اپ بھرنش کو مستند قرار دیکر اس کے اصول و قواعد اپنی کتاب میں بیان کئے۔ اپ ناگر کے بارے میں گریرسن کہتے ہیں کہ یہ غالباً گجرات اور سندھ کے درمیانی علاقے یعنی مغربی راجپوتانے اور جنوبی پنجاب میں بولی جاتی تھی[2]۔

اگر درحقیقت مغربی اپ بھرنش گجرات کی زبان ہے تو وہ اردو کا ماخذ نہیں ہو سکتی۔ اردو کھڑی سے ترقی پاکر بنی جس کی بابت عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ دہلی اور میرٹھ کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ دہلی اور میرٹھ کی زبان کسی باہری زبان سے کیوں کر ماخوذ ہو سکتی ہے

---

[1] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۳

[2] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۱۳ء صفحہ ۸۲، ۸۸۱

جو کبھی وہاں نہ تھی، اس کے حلقۂ اثر سے میلوں دور گجرات میں بولی جاتی تھی، اور راجستھانی بولیوں کے درمیان بعض علاقے نے بیچ میں حائل ہو کر ایک کو دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اردو کی لسانی خصوصیات کا مغربی اپ بھرنش سے مقابلہ کریں تو دونوں میں شدید اختلاف نظر آتا ہے اور ایک دو اصول کے سوا کوئی مشابہت نہیں ملتی۔ ذیل میں مختصر طور سے اردو اور مغربی اپ بھرنش کی لسانی خصوصیات کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

۱ — اردو کے عام طبعی میلان کے خلاف اپ بھرنش کا رجحان اسما و صفات میں مخلوط حروفِ صحیح کی جانب ہے۔ جیسے ڈھولّا (دولہا) بھلّا (بھلا) بھگّا (بھاگا) دونّی (دونوں) تجّھ (تجھ)، مجّھ (مجھ) پتّ (پوت) بپّ (باپ) اپنّا (اپنا)

۲ — مغربی اپ بھرنش کے اسما سندھی کی طرح عام طور سے "و" پر ختم ہوتے ہیں جیسے کنتُ (کانت)، اپنتُ (آتا)، جیوُ (جیو)، کاسُ (کس)، دھنُ (دھن)، پچُ (پچ = دو پاؤں) اٹھُ (اٹھ = پیارا)، گنُ (گن)۔

۳ — اپ بھرنش دو حرکات کا اجتماع گوارا کر لیتی ہے لیکن اردو اس میں ادغام کر دیتی ہے جیسے ھُوُا (ہوا)، مارِیا (ماریا = مارا)، جئی (جے = جو)، جیُو (جیو) گنئی (گنے) گئی (گئے)۔

۴ — اردو کے مزاج کے خلاف اپ بھرنش اسما کے آخر کی حرکت برقرار رکھتی ہے۔ جیسے بہنِ (بہن)، بپِّ (باپ)

۵ — قدیم پراکرت (سنسکرت) "ت" کو اپ بھرنش نے شورسینی پراکرت کی طرح "د" سے بدل لیا۔ جیسے کیلدُ (کریڈت = کھیلتا ہے) یا مہاراشٹری پراکرت کی طرح حذف کر دیا۔ جیسے جیوُ (سنسکرت جیوتم)، دہ ئین (سنسکرت دیتین)۔

۶ — اردو میں فاعلی حالت کا اظہار "نے" سے ہوتا ہے اپ بھرنش میں "یں یا ین" سے جیسے دیئیں یا دیئین (دونے) اس میں شاید ہی کسی کو شبہ ہو کہ

'نے' 'بر یں' سے ماخوذ نہیں ہو سکتا۔

۷۔۔ اردو جمع متکلم کا صیغہ 'چلیں' اپ بھرنش 'چلہوں' سے نہیں نکالا جا سکتا۔

۸۔۔ فعل حال کا لاحقہ اردو میں 'تا' ہے اور اپ بھرنش میں 'نت'۔ یہ 'نت' مغربی پنجابی میں بھی تھا۔ الف پر ختم ہونے والے مادّوں کے 'ا' کا حالیہ ناتمام میں 'ے' سے تبادلہ (ا بنت = آتا)، اپ بھرنش کا رشتہ مغربی پنجابی سے اور زیادہ مستحکم کر دیتا ہے جہاں 'ا' 'ے' سے بدل گیا ہے۔ جیسے کھیندا (کھاتا) پیندا (پاتا)[1]

۹۔۔ اردو 'مارا' کسی ایسی زبان سے لیا گیا ہے جو سنسکرت حالیہ تمام کے اسماء کا 'ت' گرا کر جین پراکرت کی طرح[2] 'ت' کو 'ی' بنا لیتی تھی اور 'مارت' کو 'ماری' یا 'ماریا' اور چلت کو چلی یا چلیا کہتی تھی، یعنی 'ی' اس میں مادے کے آخری حرف کے ساتھ مخلوط ہو کر آتی تھی جو لبعد میں حذف ہو گئی، یا مہاراشٹری کی طرح 'ت' اس میں گر جاتی تھی۔ اپ بھرنش 'مارا' اردو میں 'ماریا' ہو گا یا 'ماری' (جیسے 'وارا' سے 'واری') 'مارا' نہیں ہو سکتا۔ اردو میں آخر سے الف گر جاتا ہے۔ درمیان کی 'ی' (جو مخلوط یا مخفی نہ ہو) نہیں گرتی۔

شورسینی پراکرت بھی اردو کے 'مارت' سلسلۂ نسب میں نہیں آتی۔ شورسینی کے جو اسماء و صفات 'ُ و' پر ختم ہوتے ہیں اردو میں ان کے آخر میں 'ے، ا' ہے۔ شورسینی میں اسم حالیہ کی 'ت'، 'د' سے بدل گئی اردو میں اپنی حالت پر قائم رہی۔ پراکرت 'ے' 'ے' اور 'ُ و' (مرکب حرکات)، اردو میں 'ے' اور 'ُ و' ہیں۔ مخلوط حروف صحیح کی تخفیف کے بعد ماقبل حرکت کا اشباع شورسینی کے رجحان کے خلاف ہے۔ اردو علامت فاعل (دالہ) 'نے' پراکرت 'ے' سے زیادہ قدیم ہے۔ شورسینی قدیم سنسکرت 'ن' کو 'نڑ' کر لیتی ہے اردو میں 'نڑ' بھی 'ن' ہو جاتا ہے۔ شورسینی کا 'ی' کو 'ے' سے بدلنا اردو کے مزاج کے خلاف ہے

---

[1] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۳۶ء، صفحہ ۵

[2] ولسن فلولاجیکل لیکچرز صفحہ ۷۲

یہ چند مثالیں ہیں جو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اردو شورسینی پراکرت سے ماخوذ نہیں۔ یہ قریب قریب سبھی نے مانا ہے کہ جن پراکرتوں کا ذکر ہیم چندر، وررو چی، مارکنڈے، ترو کرم، لکشمی دھر وغیرہ عالموں نے کیا ہے وہ سب ادبی بولیاں ہیں جو بول چال کی زبان سے بن سنور کر وجود میں آئیں۔ یہ تعداد میں چھ ہیں اس لئے شڈ بھاشا، شٹ بھاشا، چھ بولیاں، کہلاتی ہیں۔ وررو چی نے مہاراشٹری، شورسینی، ماگدھی، پیشاچی چار پراکرتوں کے قواعد لکھے۔ ہیم چندر نے چولکا پیشاچی اور اپ بھرنش دو کا اضافہ کرکے چھ پراکرتوں کے اصول و قواعد بیان کئے۔ ترو کرم اور لکشمی دھر ہیم چندر کی تقلید میں ان چھ پراکرتوں کے قاعدے اور ضابطے بیان کرتے ہیں۔ اپ بھرنش کے بارے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ کسی مخصوص پراکرت کا نام نہیں۔ پراکرت میں جب تبدیلیاں ہوئیں اور وہ بگڑ بگڑا کر معیاری پراکرت سے مختلف زبان بنی تو اپ بھرنش کہلائی۔ پراکرتیں ہم عصر نہیں۔ پالی ان میں زیادہ قدیم ہے اسے اولیں پراکرت کہتے ہیں۔ نئی تحقیقات کے مطابق سنسکرت، پالی، شورسینی، مہاراشٹری، مغربی اپ بھرنش ایک زبان کے متعدد ادبی روپ ہیں۔ یہ زبان مدھیہ دیش (وسط ملک، یعنی بالائی دوآبے میں بولی جاتی تھی جس سے نکھر کر یہ زبانیں بنیں۔ بول چال کی زبان بدلتی رہی یہ زبانیں جو علم و ادب کے اظہار و بیان کا آلہ بن چکی تھیں، رکی رہیں قواعد و اصول کی پابندیوں میں جکڑے ہونے کی وجہ سے یہ وہیں رہیں جہاں تھیں۔ بول چال کی زبان ترقی کر کے بڑھ گئی یہ زبانیں بول چال کی زبان کی چھوڑی ہوئی منزلوں کی یاد دلاتی ہیں یاد دلانے سے میرا مطلب ہے کہ یہ زبانیں بول چال کی زبان کے گزرے ہوتے دوروں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ پنڈتوں نے بول چال کی زبان میں تصرفات کرنے کے بعد انہیں ڈھالا۔ بول چال کی زبان کا اصلی روپ اس سانچے میں ان سے مختلف تھا جو ان زبانوں کا ہے۔ یہ زبانیں اس کا اصلی روپ دکھاتی ہیں۔ ان کے خط و خال کا دھندلا سا عکس ان زبانوں کے آئینہ منقش و نگار میں دیکھا جا سکتا ہے مسیح علیہ السلام سے ۵۰۰ سال پہلے

پنجاب اور مدھیہ دیش (یوپی کے مغربی اضلاع) کی بولیوں پر سنسکرت کو ڈھالا گیا۔ اس کے بعد پالی کی تشکیل عمل میں آئی۔ میلاد مسیح کے بعد شورسینی اپ بھرنش وضع ہوئی۔ چوتھی صدی عیسوی میں مہاراشٹری کا خمیر تیار ہوا۔ شورسینی اپ بھرنش اس سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے جس سے اردو یا ہندوستانی نے جنم لیا۔[1]

ہر چند یہ زبانیں ارتقا کے ایک سلسلے میں واقع ہیں اور ایک ہی بولی کے پانچ مختلف دوروں کو پیش کرتی ہیں لیکن ان کو ایک دوسرے سے ماخوذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پالی مثلاً سنسکرت سے ترقی پاکر بنی، یا شورسینی پالی کا بدلا ہوا روپ ہے، یا مہاراشٹری نے شورسینی سے ارتقا پایا، یا اب بھرنش نے مہاراشٹری سے جنم لیا۔ ایک تیسری زبان سے ان زبانوں کو وضع کیا گیا۔ اگر یہ تیسری زبان ہمارے سامنے ہوتی تو ہم اس کے ارتقائی دوروں کی تعیین کرتے۔ یہ زبانیں اس زبان کے ادبی روپ کو پیش کرتی ہیں جو ان کے اصلی بول چال کے روپ سے مختلف ہے۔

اردو یا ہندوستانی اپ بھرنش کے اس روپ سے ماخوذ ہے جو گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں مدھیہ دیش میں رائج تھا۔ مغربی اپ بھرنش اس کی ادبی شکل ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، وہ بول چال کی اپ بھرنش سے مختلف ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کوئی ایسی راہ ہے کہ ہم گیارہویں صدی کی بول چال کی اپ بھرنش تک، جو ہندوستانی کی ماں ہے راہ پا سکیں؟ بول چال کی زبان کے نمونے عام طور سے محفوظ نہیں رہتے۔ ہر زمانے میں لوگ ادبی زبان کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس میں خطوط کتابت کرتے ہیں، کتابیں لکھتے ہیں، شعر کہتے ہیں۔ خطوط محفوظ رہتے ہیں۔ کتابیں دستبرد روزگار سے بچ جاتی ہیں۔ اشعار لوح قلب پر منقوش رہ جاتے ہیں۔ بات چیت فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں گونگے ہوئے لوگوں کی آوازیں غیر محدود فضا میں بھری ہوئی

---

[1] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۶۳

ہیں۔ اگر سائنس اُن آوازوں کو قید کر سکی تو ہماری رسائی بول چال کی زبان تک ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا ان آوازوں تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں۔ تیرہویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے بزرگوں کے کچھ مقولے تاریخی کتابوں میں منقول ہیں۔ ان پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مقولے مدتوں زبانوں پر نقل ہوتے رہے۔ حسب ضرورت نقل کرنے والوں نے بول چال کے مطابق ان میں تصرفات کئے، ان کے کسی لفظ کو رائج الوقت لفظ سے بدلا اور وہ کچھ سے کچھ ہو گئے۔ ان کی لسانی حیثیت وہ نہ رہی جو اس تصرف سے پہلے تھی۔

یہ بول چال کی اپ بھرنش دہلی اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی۔ چٹرجی اور گریرسن اسے مغربی اپ بھرنش کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ اپ بھرنش وہ نہیں جس کے قواعد ہیم چندر نے اپنی کتاب میں بیان کئے۔ مغربی اپ بھرنش کہنے سے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ ہیم چندر کی اپ بھرنش ہے۔ اگر یہ اشتباہ نہ ہو تو دہلی اور میرٹھ کی اس قدیم زبان کو اپ بھرنش کے نام سے یاد کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ اس زبان میں پورے پورے نمونے دستیاب نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ شوسینی اپ بھرنش کے اصول و قواعد کی وضاحت کرتے ہوئے ہیم چندر نے متعدد دوہے اپنی گرامر میں نقل کئے ہیں۔ ان میں بول چال کی اپ بھرنش کے بہت سے صیغے، شکلیں اور نحوی استعمالات بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ دسویں صدی عیسوی میں جب بول چال کی زبانیں کروٹ بدل رہی تھیں اور قانونِ ارتقا کے اثر سے نت نئے روپ اختیار کر رہی تھیں زبان کو خالص اور باہر کے اثرات سے پاک نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ زبانوں کے لئے تعمیر کا دور تھا۔ تعمیر کے دور میں زبانوں کا اختلاط معمولی بات ہے۔ ہیم چندر کے پیش کردہ دوہوں میں زبانوں کا یہ اختلاط صاف نظر آتا ہے۔ ان میں آس پاس کی بولیاں گلے ملتی اور آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔ راسو کی بابت گریرسن اور چٹرجی کے حوالے سے میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ اس کی زبان ایک طرح کا ملغوبہ ہے جس میں پنجابی، راجستھانی سے اور قدیم ہندی مغربی اپ بھرنش سے دست و گریباں

ہوئی ہے اس اختلاط و آمیزش کے اسباب جو بھی ہوں مجھے ان سے بحث نہیں۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مغربی اپ بھرنش کے وجود سے مثال کے طور پر ہیم چندر نے اپنی کتاب میں لکھے ہیں اگر ان کا لسانی تجزیہ کیا جائے اور اس کے ساتھ   کی زبان پر بھی نظر رہے کہ اردو کی لسانی خصوصیات اور اس کے صرفی نحوی سرمائے کا سراغ آسانی کے ساتھ لگ سکتا ہے۔ اور اردو کے قدیم رنگ کی تعیین کی جا سکتی ہے۔ ہیم چندر کے دوہوں اور راسو کی زبان قدیم اردو (قدیم اردو اپ بھرنش) نہیں۔ اس میں قدیم اردو زبان کے مختلف روپوں کی ملاوٹ بالکل اسی قسم کی ہے جیسے بالو میں سونے کے ذرے ملے ہوتے ہیں۔ ذیل میں ان زبانوں کی چھان پھٹک کر کے ان میں سے قدیم اردو روپ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سب سے پہلے   مذکر اسماء کے اختتامیے 'ا' کو لیجئے۔ یہ اردو کی نمایاں ترین خصوصیات میں سے ہے۔ اس کے بارے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ہیم چندر کے یہاں اس اختتامیے کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، اوپر جو مثال درج ہوئی ہے اس میں ڈھولا سانولا۔ دیہا۔ وارا۔ وغیرہ اسماء و صفات الف پر ختم ہوئے ہیں۔ مغربی اپ بھرنش کے عام رجحان کے مطابق ان کے آخر میں 'و' (ضمہ) ہونا چاہیئے تھا۔ شیام سندر داس اسے پے شاچی اپ بھرنش کا روپ بتلاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ دہلی اور میرٹھ کی اپ بھرنش کا روپ ہے۔ فعل حال اور حالیہ ناتمام کے لاحقہ 'تا' کو اس کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے، جو سنسکرت کے حالیہ ناتمام کے اختتامیے 'ت' سے ماخوذ ہے۔ اردو نے اس کے آخر میں 'ا' بڑھا کر فعل حال بنایا اور 'ہے' فعل معاون کے سہارے اسے گردانا کرتا ہے۔ کرتا ہوں۔ وغیرہ راسو میں فعل حال 'کرت ہے' 'کرت ہوں' کی شکل میں ہے۔

سو تُمہوں سنیے سُنت ہوں بات۔

(راما! وہ سب میں سنتا ہوں)

میں اوپر عرض کر آیا ہوں کہ حالیہ ناتمام پر 'ہے' بڑھا کر فعل حال بنانا اردو کی خصوصیت ہے۔ برج میں کہے۔ کروں وغیرہ افعال پر 'ہے' داخل کر کے فعل حال وضع ہوا تھا۔ راسو میں 'کرت ہوں' کے پہلو میں 'کروں' بھی ملتا ہے۔

ہوں جانی گیان ۱۰ گھوں توہی

(میں دانائے حکمت و عرفاں ہوں یہ تجھ سے کہتا ہوں)

یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ برج نے بارہویں صدی کے قریب اردو فعل حال کے صیغے لیے۔ اردو میں اس کے مزاج کے مطابق یہ صیغے 'الف' پر ختم ہوئے تھے۔ برج نے '' گرا کر، 'کرتا' کو کرت (مضمہ ت کے ساتھ) بنایا۔ مولانا شیرانی نے شیخ فریدالدین گنج شکر المتوفی ۲۶۵ھ کا مندرجہ ذیل مقولہ سید محمد بن سید مبارک کرمانی کی تصنیف سیرالاولیا سے نقل کیا ہے[1]۔

"مادر مومناں اپونوں کا چاند بالا ہونا ہے"

اس میں ہوتا ہے فعل حال الف پر ختم ہوا ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا ایک مقولہ ان کے مرید عبداللہ بن رحمان چشتی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

بھوکوں موے سوں خدا کچ اپڑتیا ہے

اس کے ساتھ حالیہ تمام اور ماضی مطلق کے صیغوں اور ان کے آخری 'ا' پر بھی بحث کرتے چلیں۔ اردو فعل حال سنسکرت حالیہ ناتمام سے ماخوذ تھا۔ ماضی مطلق سنسکرت حالیہ تمام سے لی گئی ہے۔ راسو میں دکنی اردو کی طرح ماضی کے صیغوں میں آخری حرف سے پہلے ایک 'ی' بھی ہے۔ اس کے دو صیغے ہیں۔

(اردو)		(راسو)	
چلا۔ چلے	=	چلیو۔ چلے	مذکر۔

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۲۰۰

مونث　چلی چلیں　=　چلی چلیں

دمی مخلوط بارہویں صدی کی اردو میں بھی تھی جو بعد میں تخفیف کی نذر ہو گئی۔ نی کا اختلاط اردو کی طبعِ نازک پہ گراں تھا۔ گیوں، گیا، دو چار کلموں کے علاوہ اردو میں یہ اختلاط نہیں دیکھا گیا۔ فعل حال کے لاحقہ 'تا' کی طرح قدیم اردو میں ماضی کے صیغے 'ا' پر ختم ہوتے تھے اس کے دو قرینے ہیں۔ پہلا یہ کہ 'کرنا' کی ماضی 'کیا'، راسو میں جان بیمز کو ملی ہے[۱]۔ دوسرے مولانا شیرانی تاریخ فیروز شاہی سے فیروز شاہ تغلق (۸۸ — ۱۳۵۱ء) کا یہ ہندی مقولہ نقل کرتے ہیں[۲]۔

"برکت۔ شیخ تھیا (تھا)، اک موا (مرا)، ایک نہا (نسا = بھاگا)"

اس میں تھیا۔ موا۔ نہا ماضی کے صیغے 'ا' پر ختم ہوئے ہیں۔

ہیم چندر کا مندرجہ ذیل دوہا

بھلا ہوا جُ مارا بہن مہارا کنتُ

اوپر کہیں نقل ہو چکا ہے۔ اس میں ہوا۔ مارا کے آخر میں 'ا' ہے۔ یہ دوہا گیارہویں صدی عیسوی سے پہلے کا ہے۔ مندرجہ ذیل مصرعہ بابر کی طرف منسوب ہے۔

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک دموتی

اس میں بھی 'ہوا' الف کے ساتھ ہے۔ ڈاکٹر بیلی کو یہ مصرعہ بابر کے ترکی دیوان کے مخطوطے ۱۵۲۹ء میں جس کا ایک نسخہ کتب خانہ رام پور میں ہے اسی طرح لکھا ہوا ملا[۳]۔ سکندر شاہ بادشاہِ گجرات کا یہ مقولہ سولھویں صدی کے شروع کا ہے۔

"پیر مُوا مُرید جوگی ہوا"

شاہ وجیہ الدین گجراتی کے بھتیجے شاہ ہاشم علوی کے کچھ فقرے اور اشعار

---

[۱] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۷۳ صفحہ ۱۸۵

[۲] پنجاب میں اردو (مقدمہ) صفحہ ۸

[۳] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز جلد ۶ صفحہ ۲۰۵

شمس الدین قادری نے "مقصود العاشقین" سے انتخاب کر کے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر بیلی نے ان کا زمانہ ۱۶۰۰ء بتایا ہے۔

پہلا مقولہ ہے :۔

"باپ کے اتنا دیوے سو پوت، باپ نہیں دیوے سو سپوت، باپ کا دیا چھینے سو کپوت"[1]

اس میں دیا حالیہ تمام 'ا' پر ختم ہوا ہے۔ دوسرے مقولے[2] میں جو حسب ذیل ہے:

جا مہ سنتے میں ڈوب رہا ہے خوشبو لگائے نہ کیا لفا نفع 'ڈوب رہا' کا 'رہا' حالیہ ہے اور 'ا' پر ختم ہوا ہے۔

امیر خسرو (۱۳۲۵-۱۲۵۰) کے یہ دو شعر عام تذکروں میں منقول ہیں۔

ندگر لپسرے چو ماہ پارا	کچھ گھڑے سنوارے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست	پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

ان میں پکارا۔ گھڑا۔ سنوارا۔ الف پر ختم ہوئے ہیں۔

اردو کی ایک خصوصیت مخلوط حروف کی تخفیف و تسہیل بتائی گئی تھی۔ اس کے آثار راسو کی زبان میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر ہیورنلے پراکرت پرکاش کے حوالے سے لکھتے ہیں پراکرت کے آخری دور میں مخلوط حروف میں سے ایک گرا کر اس سے پہلے حرف کی حرکت کھینچ دی گئی۔ ہیورنلے پراکرت کے اس آخری دور کی تعیین نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے کہ راسو کی تصنیف سے پہلے دسویں صدی کے آخر یا گیارہویں صدی کے شروع میں تسہیلی رجحان دہلی اور میرٹھ کی زبان میں پیدا ہوا یہ رجحان جیسا کہ میں اپنے ایک مقالے "اردو زبان کا ایک صوتی رجحان" (مطبوعہ رسالہ اردو اپریل سنہ ۱۹۵۴ء) میں تفصیل کے ساتھ لکھ

---

[1] اردوئے قدیم طبع اول صفحہ ۲۵

[2] یہ شاہ ہاشم کے مرید شاہ نظام الدین کا دوہا ہے۔

چکا ہوں۔ ویدک عہد کی بعض بولیوں میں بھی تھا۔ پراکرتیں اس کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ماگدھی پراکرت کے لاحقہ اضافت 'آہ' کی بابت کہتے ہیں کہ یہ پراکرت 'بسس' سے (بحذف 'س' اول وتبدیل 'س' ثانی بہا وتطویل حرکت ماقبل) بنا ہے۔ قدیم اردو اور راجستھانی میں یہ رجحان شائع و ذائع تھا۔ قدیم راجستھانی کے نمونے ڈاکٹر ٹیسی ٹری نے پیش کئے ہیں۔ قدیم اردو کے منتشر اور پراگندہ نمونے راسو میں دیکھئے۔

جو (سنسکرت یہ) موصولی کلمہ ہے جس کا مونث ج (بکسرۂ ج) ہے۔ پراکرت میں اس پر 'سس' لاحقہ اضافت اضافہ ہوا تو مذکر کے لئے 'جس' (بفتح اول وتشدید ثانی) ہوا۔ اور مونث کے لیے 'جس' (بکسرہ اول تخفیف وتسہیل کے بعد جس کا 'جاس' بنا اور جس کا 'جیس'۔ اردو جس جیس کی تخفیف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قدیم اردو میں 'جس' کی صرف تخفیف ہوئی یعنی اس کا 'س' حذف ہوا اس کی تسہیل یعنی 'س' کے عوض میں ماقبل حرکت کی تطویل نہیں ہوئی۔ یہ کلمہ احادی المقطع یعنی یک جزا تھا۔ اردو میں عام طور سے یک جزے کلمات کی تسہیل نہیں ہوتی۔ راسو میں البتہ 'جاس' اور 'تاس' مسہل استعمال ہوئے ہیں۔ یہ کلمے اصلاً اضافی حالت میں تھے۔ بعد میں امتداد زمانہ کے زیر اثر اردو وغیرہ زبانوں میں غیر فاعلی حالت کے لئے استعمال ہوئے۔ اضافی حالت کی دو مثالیں راسو سے لے کر درج کی جا رہی ہیں۔

۱۔ تاس راج سمیپم	(اس راجا کے قریب)
۲۔ دلیو گری جس جیس	(جس کا جس دیوگری ہے)

ان سے بیک وقت اردو کی دو اہم خصوصیتیں روشنی میں آتی ہیں۔ ایک اس کا تخفیفی رجحان۔ دوسرے ضمائر، موصولات، حروف استفہام کی غیر فاعلی حالت میں 'س' کا وجود۔ یہ خصوصیتیں بارھویں صدی عیسوی کی اردو میں بھی تھیں۔ اس کی تائید ذیل کے مقولوں سے ہوتی ہے جو شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (۹۰۰-۱۵۰۵ء) کی طرف منسوب ہیں

لہ انڈین انٹی کویری ۱۹۱۴ - ۱۹۱۹ء -

"اس سیں ہور کیا خوب ہے اس دنیا میں دل خدا سوں مشغول ہووے"[1]

دوسرا مقولہ ہے:-

"عارف اسے کہویں جو خدا سوں بھریا ہووے"[2]

ان میں 'اس' اور 'اسے' 'مکاس' غیر فاعلی حالت کی علامت ہے۔

شیخ بہاء الدین باجن (متوفی ۹۱۲ھ) کے دوہروں میں بھی اردو کا یہ 'س' موجود ہے

باجن وہ کسی سریکھا نہیں اور اُس سریکھا نہیں کوی

جیسا کوی من منۂ چنت دے ویسا بھی نہ ہوی

(سریکھا = مثل۔ من منۂ = من میں۔ چنت ۔ سوچے یا چنتا کرے)

باجن جو کسی کے عیب ڈھانکے — اُس تھے ورجن بھتر کانپے[3]

محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ - ۱۶۱۱) کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے — کبھیں اس سے مل بیسیا جائے نا

'میں' اور 'پر' اردو کے ظرفی لاحقے ہیں جو اردو کی خصوصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ 'داسو' میں 'پر' اور 'نے' علامتی علیحدہ سے استعمال ہوتے ہیں۔ 'پے' اردو میں 'پر' ہے 'میں' کی جگہ چند برائی نے مدھ - مدھیے - مجھ - مانجھ - مہی - ماہم وغیرہ صیغے استعمال کئے ہیں جن میں سے 'مہی' اور 'ماہم' کے بارے میں ہیورنلے وغیرہ علمائے لسانیات کا خیال ہے کہ 'میں' کے قدیم ترین روپ ہیں۔ 'ماسو میں' میں بھی ملتا ہے۔ جیسے۔

ایک ماس میں نگر بسایو (ایک ماہ میں شہر بسایا)

یہ مصرعہ حال کی زبان سے بہت قریب ہے۔ شاید اہل علم اس کی قدامت سے انکار کریں لیکن حافظ محمود شیرانی اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مصرعہ

---

[1] اردوئے قدیم، طبع اول، صفحہ ۴۲

[2] " " "

[3] بحوالہ پنجاب میں اردو صفحہ ۴۰۸ .

چند بردائی کا ہے۔ ذیل کے شعر میں بھی 'میں' ہے۔ لیکن بیمز اسے مصنوعی سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہر چند اس کا اسلوب چند کا ہے لیکن یہ شعر الحاقی معلوم ہوتا ہے۔

(وہ ناری نیچے کرے بڑے ترک میں واس)

(وہ عورت بے شبہ جہنم کے درک اسفل میں اپنا ٹھکانا کرے گی)

واحد متکلم کے لئے 'میں' خاص اردو ہے۔ برج بھاشا اور پنجابی میں 'ہوں' اس کا جانشین تھا۔ راسو میں 'ہوں' کے ساتھ میں بھی دیکھا گیا ہے۔

میں سُنیا ساھی بِت اِنشی کیس   تَج بھوگ جوگ میں تپ لین

(میں نے سنا کہ شاہ نے اس کو اندھا کر دیا۔ کھانا پینا چھوڑ کر میں نے تپسیا کی) 'میں' کی غیر فاعلی حالت 'مجھ' ہے اور تم کی 'تجھ'۔ 'میں' اور 'تم' کے ساتھ ان کی غیر فاعلی حالتیں 'مجھ' اور 'تجھ' بھی راسو میں ملی ہیں۔ 'ہم' اور 'تم' کی مثالیں :-

ہم تم کبھو نہ ور دہ   (ہم تم کبھی مخالف نہیں ہوئے)

ہم تم کام اہ سیت آج   (ہم تم آج اس کھیت میں کام کریں گے)

'مجھ' اور 'تجھ' کی مثالیں :-

اہ دھرتی مجھ بپت پرپت   (یہ زمین میرے باپ دادا کی)

ثروں سناؤں تجھ   (تجھے یہ قصہ سناؤں)

میرے۔ میری۔ ہمارے۔ ہماری متکلم ضمیروں کی اضافی حالتیں ذیل کے مصرعوں میں ملاحظہ فرمائیں۔ 'میرے' کی مثال :-

ست بھرات میرے ہتے   (سات بھائی میرے مارے گئے)

'میری' کی مثال :-

اہ میری عرض داست   (یہ میری عرض داشت ہے)

ہماری کی مثال :-

آلھا سنو ہماری تیہ (آلھا ہماری بات سنو)

'وہ' نہ سہی اس کی جمع 'وے' ذیل کے مصرعے میں ہے۔

دے دارے ترو ار (وے تلوار چلاتے ہیں)

جیسو (جیسا)، کیسو (کیسا)، کتنو (کتنا)، وغیرہ کلمات راسو میں برج کے لہجے میں استعمال ہوئے ہیں۔

اردو کی طرح چند نے حاصل مصدر مادے پر 'ن' بڑھا کر بنایا ہے "بھیو چلن کو ساج" (چلنے کا ساز و سامان کیا)

پرشاتن تن بندھن بجاے (ان کے پرشاتن کو روکنے کی فکر کرکے) 'نے' یا 'نیں' کا استعمال بھی ہوا ہے۔

پر تھی راج سنی کنور نین۔ آپ بلائے حت۔

(کنور پرتھی راج نے سن کر آپ بڑے چاؤ سے مہمان بلائے)

اودھی اور پنجابی لہجے کے مطابق چند بردائی نے 'دہ' کو 'اہ'، اودیہ، 'کواہ' لکھا ہے لیکن ذیل کے مصرعے میں 'یہ'، اردو کی غمازی کر رہا ہے۔

یہ پرمال لشیو۔ کر دیئو (پرمال نے یہ لکھا ہے) کہہ کر اس کے ہاتھ میں دے دیا)

اُن۔ ان۔ کوں (کو)۔ کے۔ کی۔ (اضافت کے لئے) کا استعمال بھی عام طور سے راسو میں دیکھا گیا ہے[1]۔ علامت مستقبل 'گا' کا سراغ راسو میں نہ مل سکا لیکن شیخ شرف الدین بو علی قلندر (متوفی ۷۲۴ھ) کا حسب ذیل دوہرہ مولانا شیرانی مرحوم نے نقل کیا ہے۔ اس میں 'گا' موجود ہے۔

---

[1] یہ مثالیں جان بیمز کے مقالے "چند بردائی کی گرامر" سے ماخوذ ہیں۔ جو جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی اشاعت ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔

سکھن سکلا بسے جائیں گے نین مریں گھم روے
بد صنا ایسی رین کر بھور کدھی نا ہوے

ذیل کا شعر کبیر کا ہے :-

ماٹی کہے کمہار کوں تو کہاں روندے موہیں
اک دن ایسا ہوے گا میں روندوں گی توہیں

شیخ باجن کے یہاں "بھی گا" کا سراغ ملتا ہے۔

باجن بھکاری بھکھان کرے گا بھیک کے کارن کچھ کچھ کہے گا

اوپر جو صیغے اور ان کی مختلف شکلیں راسو، اپ بھرنش، اور صوفیہ کرام کے مقولوں سے اخذ کرکے درج ہوئیں وہ اردو کی اہم لسانی خصوصیتیں ہیں جن کا ذکر اس مقالے کی تمہیدی حصے میں تفصیل کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ یہ صیغے گیارہویں صدی کے قریب دہلی اور میرٹھ کی زبان میں رائج تھے۔ آج کی اردو میں بھی جوں کے توں یا کسی قدر تصرف کے ساتھ ان کا عام رواج ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ اردو نے جس قدیم اپ بھرنش سے ارتقا پایا، گیارہویں صدی میں اس کی شکل موجودہ اردو سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ وہ اس زمانے میں بھی برج، ہریانی، مشرقی پنجابی وغیرہ پاس پڑوس کی زبانوں سے مختلف اور آزاد زبان تھی۔ اس نے شورسینی اپ بھرنش اور پراکرت سے جس کے قواعد ہیم چندر اور مارکنڈے بیان کرتے ہیں، ارتقا نہیں پایا۔ وہ دہلی اور میرٹھ میں بولی جانے والی اپ بھرنش سے ترقی پاکر بنی۔ ہر چند اس اپ بھرنش کے خط و خال واضح نہیں لیکن اردو کی موجودہ خصوصیات کو دیکھ کر اس کے نقش و نگار کی تعین نہ سہی اس کا دھندلا سا خاکہ، جو کسی قدر غبار آلود بھی ہے مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں ضرور آجاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شورسینی اور ماگدھی اپ بھرنش کی طرح یہ آزاد اور مستقل اپ بھرنش ہے لیکن ڈاکٹر گریرسن کی ہم نوائی میں کہا جا سکتا ہے "ہندی تحریروں کی اپ بھرنش ہوتے ہوئے بھی بعض اہم لحاظ میں یہ ان سے مختلف ہے"[1]۔

---

[1] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۲ حاشیہ صفحہ ۳۵۰

مولانا شیرانی نے صوفیہ کرام کے چند مقولے درج کرنے کے بعد لکھا تھا[1]:

"ان فقرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) ہی میں اپنے امتیازی خط و خال نمایاں کر چکی ہے یعنی اس میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو اس کو ایک طرف برج سے اور دوسری طرف پنجابی سے ممیز کرتی ہیں۔ ہوتا ہے نہ پنجابی ہے نہ برجی اس سے اس امر کا پتا چلتا ہے کہ اہل پنجاب ان ایام میں اردو بول اور سمجھ سکتے تھے۔"

مسٹر اے ہرنیکوف کے حسب ذیل بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

"کھڑی بولی ایک آزاد زبان ہے۔ مقامی بولیوں میں سے کسی ایک بولی کی اساس پر اس کی تعمیر ہوئی۔ لیکن یہ سوال کہ یہ مقامی بولی دہلی، آگرہ، میرٹھ کی زبان تھی، جیسا کہ ہندو علماء کا خیال ہے، یا پنجاب کی کوئی بولی، جیسا کہ ڈاکٹر گریرسن فرماتے ہیں، موجودہ بحث کے حدود میں نہیں آتا۔"[2]

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۳۰۱

[2] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۸ ص ۳۷۹

(۶)

اخذ و استفادہ

ڈاکٹر ہیوڈ نلے کی کتاب "گوڈین زبانوں کی تقابلی گرامر" ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی اس کے مقدمے میں انھوں نے پاک و ہند کی جدید آریائی زبانوں کے رشتوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ ہندوستان کی لسانیاتی تاریخ کے چار دور ہیں۔ دور اول میں ماگدھی پراکرت کا رواج تھا جو کسی نہ کسی شکل میں شمالی ہند کے مختلف حصوں میں بولی جاتی تھی۔ اس وقت تک آریا قبائل مشرق کی طرف نہیں گئے تھے۔ دوسرے دور میں ماگدھی کے پہلو بہ پہلو شورسینی ابھری اور دونوں ساتھ ساتھ بولی جانے لگیں۔ تیسرے دور میں ان میں سے ہر ایک دو دو بولیوں میں بٹ گئی۔ شورسینی نے مغرب اور شمال کی آریائی زبانوں کو جنم دیا اور ماگدھی نے مشرق اور جنوب کی بولیوں کو۔ چوتھے اور آخری دور میں جدید آریائی زبانیں نمودار ہوئیں۔ پہلے دور کی ابتدا مسیح علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً ایک صدی پہلے ہوئی۔ یہ وررچی کی پراکرت گرامر کی تصنیف کا زمانہ ہے۔ جدید آریائی زبانوں کا قدیم ادب تیسرے دور کی نشان دہی کرتا ہے اور ہند آریائی زبانوں کے تیسرے درجہ ارتقا کی جھلک دکھاتا ہے۔ اس ادب میں یک

طرف مغرب کی شورسینی بولیاں مغربی ہندی، پنجابی، گجراتی، راجستھانی گڈمڈ نظر آتی ہیں، دوسری طرف بنگالی اور بہاری ایک دوسرے سے گلے مل رہی ہیں۔ مغرب کی آریائی زبان کے شاعر چند بردائی کے یہاں مغربی ہندی پنجابی، گجراتی، راجستھانی زبانوں کے درمیان امتیاز نہیں ہے۔ مشرقی زبان کے شاعر ودیاپتی کے یہاں بنگالی اور بہاری کا ملاپ نظر آتا ہے۔ پندرہویں صدی کے بعد جب آریائی زبانوں کے خط و خال اُبھر کر نمایاں ہوئے تو کبیر داس، تلسی داس، کوی کنکن، چیتنیہ، تکارام، نرسنگھ مہتا کے کلام میں آج کی آریائی زبانیں ممتاز نظر آئیں۔[1]

مجھے فی الحال پہلے اور دوسرے دور سے بحث نہیں۔ تیسرے دور میں ڈاکٹر گریرسن کے خیال میں پنجابی، مغربی ہندی، گجراتی، راجستھانی کے درمیان امتیاز نہ تھا۔ ان زبانوں کے علاقوں میں ایک زبان بولی جاتی تھی جو بعد میں چار حصوں میں تقسیم ہوئی۔ ڈاکٹر گریرسن ۱۹۰۰ء سے پہلے ہیرنلے کی رائے سے اس حد تک متفق تھے کہ مشرقی پنجابی، گجراتی، راجستھانی، مغربی ہندی زبانوں کو ایک گروہ میں رکھ کر انہوں نے مغربی وسطی گروہ یا وسطی گروہ کا نام دیا۔[2] ۱۹۰۰ء کے بعد انہوں نے مغربی ہندی کو مدھیہ دیش کی زبان بتایا اور پنجابی، راجستھانی گجراتی کو ہندی، لہندا اور سندھی کے درمیان رکھ کر کہا کہ مدھیہ دیش کی زبان مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ قدیم زمانے میں یہ دوآبے میں بولی جاتی تھی جو آریائی تہذیب کا مرکز تھا۔ وسطی گروہ کی یہ تنہا نمائندہ زبان ہے۔ پنجابی، گجراتی اور راجستھانی ایک طرف ہندی دوسری طرف لہندا اور سندھی کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے بین بین حیثیت رکھتی ہیں۔ شمال مغرب کی طرف مغربی ہندی کے دھندلے نشان وہی پنجابی کرتی ہے اور جنوب مغرب کی طرف اس کے اقدام کی جھلک راجستھانی اور گجراتی زبانوں کے آئینۂ خط و خال میں نظر آتی ہے۔"

[1] مقدمہ صفحہ ۲۹ : ۳۰
[2] کشمیری زبان کے لاحقے "مطبوعہ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۹۵ء صفحہ ۳۳۶۔

شمال مغرب میں پنجابی اور جنوب مغرب میں راجستھانی (جس میں گجراتی بھی شامل ہے) ایک طرح سے مخلوط اور ملی جلی زبانیں ہیں جنہوں نے مغربی ہندی سے بیش از بیش استفادہ کیا۔ اور اس استفادے کی وجہ سے وہ اتنی بدل گئیں کہ ان کی اصلیت مشتبہ ہو گئی۔ گریرسن اور ہیورنلے کے نزدیک اصل و نسل کے لحاظ سے وہ بیرونی حلقے کی زبانیں ہیں۔ ان کا تعلق سندھی لہندا اور کشمیری سے ہے لیکن مغربی ہندی کے اثر میں آنے کے بعد مدھیہ دیش کی زبان سے یہ اتنی قریب ہو گئیں کہ اندرونی گروہ کی معلوم ہونے لگیں۔ مغربی ہندی نے مشرق کی طرف بڑھ کر مشرقی ہندی کو بھی متاثر کیا۔ یہ تاثر مغرب کی زبانوں میں زیادہ نمایاں ہے۔ اس کی وجہ گریرسن یہ بتلاتے ہیں کہ کسی قدیم زمانہ میں غالباً کثرتِ آبادی کے باعث مدھیہ دیش کے باشندوں نے شمال کی طرف بڑھ کر پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور جزوی طور سے اپنی زبان ہندی وہاں کے باشندوں پر مسلط کر دی تھی۔ اس وقت پنجاب میں لہندا کا بول بالا تھا۔ موجودہ پنجابی مدھیہ دیش کی زبان کے تغلب اور تسلط کا نتیجہ ہے۔ وہ نصف ہندی ہے اور نصف لہندا۔ پنجاب کے تین حصے ہیں۔ مشرقی پنجاب میں اردو (ہندوستانی) بولی جاتی ہے۔ وسطی پنجاب میں موجودہ پنجابی کا رواج ہے۔ مغرب میں لہندا کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ پنجاب کی اس لسانی تقسیم کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ پنجاب کا جو حصہ مدھیہ دیش سے ملحق ہے وہ مدھیہ دیش کی زبان مغربی ہندی سے بیش از بیش متاثر ہوا۔ مغرب کی جانب لہندا کے علاقے تک پہنچتے پہنچتے تاثر کا زور ختم ہو گیا۔ راجپوتانے کی بولیوں کی کیفیت بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ مغربی ہندی راجپوتانے کو روندتی ہوئی گجرات تک پہنچ گئی۔ گجرات کی زبان بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں لیکن مدھیہ دیش سے قریب ہونے کی وجہ سے راجستھانی مغربی ہندی سے نسبتاً زیادہ مشابہ ہے۔ راجستھان کی طرف مغربی ہندی کے دھاوے کا گریرسن نے تاریخی ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ انہوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ مدھیہ دیش کے باشندے راجستھان کی طرف ہجرت کر کے گئے۔

اور وہاں انہوں نے مستحکم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ گریرسن کے بیان کردہ تاریخی حقائق میں یہاں دخل دینا نہیں چاہتا۔ جو چاہیں وہ ان کے مقالے "ہند آریائی بولیاں" (مطبوعہ بلٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز جلد اول) ملاحظہ فرمائیں۔ پنجاب کی طرف ہجرت کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ گریرسن کا قیاس ہے جو لسانی اور تہذیبی بنیادوں پر قائم ہے۔ مولانا شیرانی کا فرمانا

"ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سیاسی واقعات کا بہاؤ شمال سے زیادہ تر جنوب کی طرف رہا ہے۔ سیاسی واقعات نیز مغلوں کے دباؤ کے زیر اثر اٹھویں اور نویں صدی ہجری میں بڑے بڑے گروہ ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہوتے رہے ہیں[1]۔"

درست ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا

"ان واقعات کے سامنے ہندوستانی زبان کے شمال کی طرف بڑھنے اور لہندا کو پیچھے دھکیلنے کا کوئی مناسب موقع نظر نہیں آتا[2]۔"

مجھے حقیقت سے بعید نظر آتا ہے۔ مولانا جن سیاسی واقعات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں وہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد کے ہیں۔ اس سے پہلے ان کا بہاؤ "دوآب" یا مولانا کے لفظوں میں "میانداب" سے شمال کی طرف رہا۔ دوآب آریائی تہذیب و ثقافت کا مرکز تھا۔ یہاں کی تہذیب کے اثر سے گرد و پیش کی تہذیبیں اور یہاں کی زبان سے نواح کی زبانیں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ مہابھارت میں پنجاب اور وہاں کے دلیر باشندوں کی بابت جو کچھ کہا گیا ہے وہ بے شبہ غلط ہے۔ مجھے مولانا شیرانی سے اتفاق ہے کہ یہ بیان دشمن کے قلم کا ٹپکایا ہوا زہر ہے لیکن یہ حقیقت

---

[1] پنجاب میں اردو، طبع دوم، صفحہ ۹۷
[2] پنجاب میں اردو، طبع دوم، صفحہ ۹۷

ہے کہ آریا تہذیب کا خمیر میانداب کی سرزمین سے اُٹھا۔ ہندوستان کے قدیم مذاہب بہار سے لے کر متھرا تک کے علاقے میں وجود میں آئے۔ رام اور کرشن کی تحریکیں اور ان کی لہریں ساحل گنگ وجمن سے اُٹھ کر پنجاب تک پہنچیں[1]۔ تہذیبی واقعات کا بہاؤ برابر جنوب سے شمال کی طرف رہا۔ زبان انسانی تہذیب و شائستگی کا سب سے بڑا اور قیمتی سرمایہ ہے۔ جو قومیں زیادہ مہذب، زیادہ شائستہ اور زیادہ قیمتی لسانی سرمایہ کی مالک ہوتی ہیں وہ دوسری اقوام کی تہذیب و زبان کو متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑتیں۔

جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے اس لسانی تاثر کے کئی دور ہیں۔ پہلا زیادہ قدیم ہے اس کا آغاز ہیورنلے کے نظریے کے مطابق آریائی زبانوں کے تیسرے دور سے ہوا اس دور میں دوآبے کی زبان مغربی ہندی نے پنجابی پر اثر ڈالا۔ دوسرا دور مسلمانوں کی دہلی میں آمد کے بعد کا ہے اس کا ذکر مولانا شیرانی فرماتے ہیں۔ اس دور میں پنجابی نے کسی قدر اردو کو یا اردو کے دکنی روپ کو متاثر کیا۔ تیسرا دور اس وقت شروع ہوا جب مسلمانوں نے دہلی میں نئی مرکزی حکومت قائم کی اور دکن، گجرات، بنگال وغیرہ صوبے فتح کر کے اپنی نئی مرکزی حکومت کی حدود کو وسیع کیا، اس کی بنیادوں کو استوار بنایا۔ اس دور میں دہلی کی زبان اردو مسلمانوں کے ہمرکاب رہی۔ وہ ان کے گھوڑوں کے سموں سے اٹھائی ہوئی گرد کے ساتھ ہر مقام پر پہنچی، وہاں کی زبانوں کو روندا، اپنی شخصیت سے متاثر کیا۔ مولانا ان تینوں دوروں میں خلط ملط کر دیتے ہیں۔

مغربی ہندی کی پانچ بولیوں میں سے ہندوستانی (اردو) اصل زبان کی نمائندہ ہے اور جیسا کہ گریرسن نے لکھا ہے، ہندوستانی کی گرامر مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کے لیے معیار کی حیثیت رکھتی ہے[2]۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا۔ کہ اسوکی زبان کو غلطی سے

---

[1] "معارف" اگست ۱۹۲۸ء صفحہ ۱۱۵

[2] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۳

قدیم ہندی سمجھ لیا گیا۔ اور چونکہ یہ برج سے زیادہ قریب تھی، اس لئے مغربی ہندی کی نمائندہ زبان برج بھاشا قرار پائی۔ میں اس پر تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ ہیورنلے کی رائے اوپر لکھی جا چکی ہے۔ راسو کی زبان اس عہد کی ہے جب ہندی پنجابی سے ممتاز نہ تھی اور پنجابی راجستھانی سے۔ ان کے امتیازی خطوط خال ابھر کر ہنوز نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ میرے خیال میں ہندوستانی نے جب مدھیہ دیش سے قدم باہر نکالا اور اس کا سابقہ ایک طرف لہندا سے پڑا، جو بقول گریرسن اس وقت پورے پنجاب پر چھائی ہوئی تھی، دوسری طرف اس کی مڈبھیڑ راجستھانی سے ہوئی تو اس تصادم یا میل ملاپ سے ایک طرح کی ملی جلی اور مخلوط زبان وجود میں آئی۔ یہ راسو کی زبان ہے۔ چٹرجی، راسو کی زبان کو شائد اس لئے خود ساختہ بتاتے ہیں کہ بارہویں صدی عیسوی میں جو راسو کی تالیف کا زمانہ ہے اس قسم کی مخلوط زبان کا وجود نہ تھا۔ کوئی ایسی زبان نہ تھی جو کہیں بولی جاتی ہو اس وقت ہندوستانی، راجستھانی، پنجابی، گجراتی زبانیں ابھر کر ایک دوسرے سے ممتاز اور مختلف ہستی کی مالک بن چکی تھیں۔ مغربی ہندی کی بولیوں میں ہریانی، جو دراصل ہندوستانی کی شاخ ہے، ملی جلی زبان کی بڑی اچھی مثال ہے۔ ہریانی بارہویں صدی کے بعد ابھر کر سامنے آئی۔ اس لئے اس پر وہ دھندلکا نہیں جو راسو کی زبان پر چھایا ہوا ہے۔ ہریانی کا کچھ حصہ ہندی ہے اور کچھ پنجابی یا راجستھانی" وہ ایک طرح سے راسو کی قدیم مخلوط زبان کی تشکیل نو ہے۔

ہندوستانی (اردو) دوآب کی اہم نمائندہ زبان ہے اس کا ثبوت خود اس کی ساخت ہے۔ گریرسن نے مغربی ہندی کی نمایاں ترین خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ مکمل طور سے تحلیلی زبان ہے۔ فعل کی ایک گردان (مضارع) اور اسم کی ایک اعرابی حالت (غیر فاعلی) کو چھوڑ کر تقریباً تمام بحثوں اور اعرابی حالتوں کا اظہار اس میں حالیہ، معاون افعال، اور حروف مغیرہ کی مدد سے ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت صرف اردو میں پائی جاتی ہے۔ اردو

میں قدیم افعال کا بقیہ صرف ایک فعل مضارع ہے، پنجابی، راجستھانی، گجراتی سندھی اور برج میں مضارع کے علاوہ مستقبل بھی ہے جو کہیں 'س' کے اضافے سے بنا ہے (پنجابی راجستھانی وغیرہ میں) اور کہیں 'ہ' کے اضافے سے (برج) اردو ماضی حالیہ تمام سے بناتی ہے اور فعل حال حالیہ ناتمام سے۔ ان کا استعمال اردو میں تحلیلی انداز سے ہوتا ہے۔ یعنی ان کے ساتھ فاعل کی ضمیریں متصل نہیں ہوتیں۔ جیسے 'وہ گیا'، 'وہ جاتا ہے'۔ 'میں گیا'، 'میں جاتا ہوں'، 'ہم گئے'، 'ہم جاتے ہیں'۔ ان مثالوں میں 'گیا' 'جاتا' وغیرہ افعال کے ساتھ فاعل کی ضمیریں مل کر نہیں آئیں، ان سے الگ رہیں۔ کشمیری، سندھی، مغربی پنجابی بیرونی گروہ کی زبانیں ہیں۔ ان میں افعال کے ساتھ فاعل کی ضمیریں ملی ہوتی ہیں۔ چند مثالیں وضاحت کے لئے کافی ہوں گی:۔

(سندھی)	(لہندا)	(اُردو)
واحد متکلم۔ چلیوسے	چل اس، چل ام	(میں) چلا
جمع متکلم۔ چل آسیں	چل او سے	(ہم) چلے

س، م واحد متکلم کی ضمیریں ہیں اور سیں، یا، سے، جمع متکلم کی جو فعل کے ساتھ متصل ہیں۔

فعل حال کی مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(سندھی)	(لہندا)	(اُردو)
متکلم (واحد) چلنسے	چلندا	چلتا
متکلم (جمع) چلندا سیں	چلندے	چلتے

سندھی میں بدستور یہاں بھی فاعل کی ضمیریں فعل سے متصل رہیں البتہ لہندا نے اردو کے اثر سے (بواسطہ پنجابی) ان ضمیروں کو تراش کر فعل سے الگ کر دیا۔

اردو میں صرف ایک تالیفی ظرفی حالت ہے جو کہیں کہیں ظروف میں مستعمل ہے

جیسے سویرے، اندھیرے، اجالے۔ دریا کنارے، اونچیو کی نے، سندھی اور لہندا
میں ابتدائی، ظرفی، آ، ای تین قدیم تالیفی حالتیں ہیں۔ اس کے علاوہ لہندا اور سندھی فعل مجہول
'ی' کے اضافے سے بناتی ہیں۔ اردو میں اس کے مزاج کے مطابق مجہول فعل معاون
'جانا' اور اس کے صیغوں کی مدد سے بنتا ہے اس باب میں اردو تحلیلی ہے۔

اردو نے اپنی تحلیلی فطرت سے پنجابی کو متاثر کیا۔ پنجابی میں تالیفی فعل مستقبل مستقل
تھا۔ جو مارواڑی، گجراتی اور برج کی طرح 'سی' لگا کر بنایا جاتا تھا۔ اردو کے اثر سے تالیفی مستقبل
ترک کر کے پنجابی نے اردو کا تحلیلی انداز اختیار کیا اور 'گا' بڑھا کر مستقبل بنانے لگی۔ مولانا
شیرانی فرماتے ہیں 'سی' کی تعریف سے جو مستقبل بنتا ہے اس کا تعلق زیادہ تر لہندا یا
ملتانی سے ہے[1]۔ میں اوپر عرض کر آیا تھا۔ کہ جیسے جیسے مغرب کی طرف جائیں پنجابی پر
اردو اثرات کم ہوتے جاتے ہیں۔ اردو کے تحلیلی رجحان کے اثر سے 'سی' والا مستقبل
کبھی پنجابی میں بھی تھا آج نہیں رہا۔ ملتانی میں آج بھی ہے۔

دوآبے کی زبان کی دوسری بڑی خصوصیت جو اس کی مرکزیت ثابت کرتی ہے
اس کا قدیم واضح اور صحیح تلفظ ہے۔ اردو میں 'س' کا تلفظ ٹھیک اسی طرح ہوتا ہے
جس طرح کبھی اس علاقے کی قدیم زبان سنسکرت میں ہوا کرتا تھا۔ اردو عام طور سے
'س' کو 'س' رکھتی ہے 'ہ' سے نہیں بدلتی۔ عام طور سے اس لیے کہ اردو میں چند کلمے
ایسے بھی ہیں جن میں 'س' صورت بدل کر 'ہ' ہو گیا ہے یہ تعداد میں بہت کم ہیں اور اس
کے کئی قرینے ہیں کہ اردو نے ان کے 'س' کو 'ہ' سے نہیں بدلا۔ یہ کلمے کسی دوسری زبان
سے اردو میں آئے اور جس وقت آئے ان کا 'س' روپ بدل چکا تھا، آج وہ اپنی بدلی
ہوئی شکل میں سکۂ رائج الوقت بنے ہوئے ہیں۔ مثلاً گیارہ سے لے کر اٹھارہ تک کے
اعداد، ان کے آخر کی 'ہ' 'س' کا بدلا ہوا روپ ہے۔ گیارہ = ایکادش = اکادس = اکادہ = اگارہ

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۱۰۸

ہ گیارہ ان چند کلمات کو چھوڑ کر اردو نے پراکرت کے 'س' کا تلفظ 'س' ہی کیا۔ نہ اسے پنجابی اور سندھی کی طرح 'ہ' سے بدلا اور نہ بنگالی کی طرح 'ش' سے۔ اردو کے اس تلفظ کا اثر مغرب میں پنجابی پر ہوا اور مشرق میں بہاری پر۔ پنجابی کے بہت سے کلمے ہیں جن کا 'س' اس کے مزاج کے مطابق 'ہ' ہو جانا چاہیے۔ لیکن اردو کے اثر سے وہ 'ہ' نہیں ہوا۔ پنجابی میں 'تہاڈا' یا 'تواڈا' کی ایک شکل 'تساڈا' (س کے ساتھ) ہے۔ اس (اہ)، اس ایہہ) کیسا (کیہا)، ان سب پر اردو کی چھاپ ہے۔ بہاری میں جہاں 'س' کو 'ش' لکھا جاتا ہے لیکن قدیم اردو کے اثر سے اس کا تلفظ 'س' ہی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر چٹرجی نے اسماء اعداد کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تصریح کی ہے کہ گیارہ سے اٹھارہ تک کے اعداد اپنی ساخت اور فطرت کے لحاظ سے اردو معلوم نہیں ہوتے۔ ان میں دوہری بے ضابطگی ہے۔ قدیم 'د' کا 'ڈ' ہوتے ہوئے 'ر' بن جانا مشرقی پراکرت کی خصوصیت ہے اور 'س' کا 'ہ' سے بدل جانا پنجابی وغیرہ شمال مغربی زبانوں کا خاصہ ہے۔ ایسے الفاظ اردو میں اور بھی ہیں جن کا 'س' 'ہ' ہو گیا ہے لیکن یہ الفاظ اردو میں باہر سے درآمد ہوئے ہیں۔

اس سلسلے کی ایک اور خصوصیت 'ہ' اور ہائیہ حروف (تھ۔ دھ۔ چھ۔ بھ وغیرہ) کا تلفظ ہے اردو کی خصوصیت ہے جس میں مشرقی ہندی اور بہاری اس کی شریک ہیں کہ وہ 'ہ' کا تلفظ واضح اور جلی انداز میں کرتی ہے اور قدیم ہائیہ حروف کو علی حالہ باقی رکھنے میں (چٹرجی کے الفاظ میں) قدامت پسند اور کہنہ خیال یعنی لکیر کی فقیر واقع ہوئی ہے۔ کلمے کے آخر کی 'ہ' کا عام طور سے اظہار نہیں ہوتا۔ فارسی کی ہائے مختفی کی طرح وہ تلفظ میں دب جاتی ہے لیکن اردو 'ہ' کا اظہار کرتی ہے 'بارہ' اور 'نلوہ' کی 'ہ' اردو میں پوری پوری ادا ہوتی ہے اسی طرح گھما گھمی، جھاڑ جھنکار، سانجھ، بانجھ، باگھ، ڈھول

ﻪ انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۸۸۔۸۷

پڑھ، دھو، ڈھو، بھائی، پھوپی، الھاڑ وغیرہ کلمات کے ہائیہ حروف اس سے قطع نظر کہ وہ شروع کلمے میں ہیں یا آخر میں، اردو میں جلی اور واضح طریقے سے ادا ہوتے ہیں۔ سننے والوں کو ان کا ہائیہ عنصر صاف سنائی دیتا ہے۔ بھابی اور پھوپی وغیرہ کلمات کا پہلا جزو ہائیہ ہے لیکن میں نے بعض لوگوں کو 'بھابھی' اور 'پھوپھی' بولتے سنا ہے جو غالباً ہائیہ کے نمایاں تلفظ کا اثر ہے۔ اس کے برعکس اردو کے دائیں بائیں آگے پیچھے بولی جانے والی زبانیں پنجابی، سندھی، راجستھانی، گجراتی نیز بنگالی ہ کے ساتھ جا ہے وہ تنہا ہو یا کسی حرفِ صحیح کے ساتھ مخلوط، کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتیں۔ کہیں اسے گرا دیا جاتا ہے اور کہیں ہمزہ کی طرح اس کا تلفظ کیا جاتا ہے۔

ماضی مطلق سنسکرت حالیہ تمام سے ماخوذ ہے۔ سنسکرت میں حالیہ تمام اگر لازم ہے تو معروف ہو گا۔ جیسے سہ گتہ (وہ گیا) سہ چلتہ (وہ چلا) لیکن حالیہ تمام متعدی معروف بھی ہو سکتا ہے۔ اور مجہول بھی۔ سہ مارتہ (وہ مارا گیا) مجہول ہے۔ اور تین ماتہ (اس نے مارا) معروف۔ حالیہ تمام متعدی معروف کے استعمال کی سنسکرت میں دو صورتیں ہیں۔ بطور مجہول۔ اس صورت میں فعل مفعول کے مطابق ہوگا۔ جیسے "تین بھکتم کھادتم" (اس نے بھات کھایا) "تین روٹکا کھادتا" (اس نے روٹی کھائی) ان مثالوں میں 'بھات' اور 'روٹی' مفعول ہیں اس لئے پہلی مثال میں 'کھادتم' بھکتم کے مطابق بے جنس ہے (اردو میں 'کھایا' بھات کی نسبت سے مذکر ہے) اور دوسری مثال میں 'روٹکا' کے تعلق سے کھادتا مونث ہے (اردو میں 'کھائی' مونث ہے اس لئے کہ روٹی مونث ہے) دوسرے بطور نا مجہول۔ اس صورت میں فعل ایک حالت پر قائم رہے گا۔ مفعول کی تبدیلی سے فعل میں تبدیلی نہ ہوگی۔ جیسے "تین راجنہ کرتہ درشتم" (اس نے راجہ کو دیکھا) اس مثال میں 'راجہ' مذکر ہے اس کے باوجود "درشتم" بے جنس ہے۔

اردو اور پنجابی نے سنسکرت کے ان استعمالات کو برقرار رکھا اور ان میں کوئی

ردوبدل نہیں کیا۔ دوسری جدید زبانوں نے ان میں سے کسی استعمال کو قائم رکھا اور کسی میں تھوڑا بہت تصرف کر لیا۔ بنگلا، آسامی، بہاری اور اڑیا نے مجہول کو معروف بنا لیا۔ اور راجستھانی، گجراتی نے مجہول و نامجہول کو ملا کر ایک نیا مرکب گھڑا جیسے تے نے استری نے ماری (بجائے ماریں) اردو میں گجراتی محاورے کے مطابق اس کا ترجمہ ہوگا۔ اس نے استری کو ماری (بجائے مارا) مغربی پنجابی اور سندھی نے قدیم مجہولی استعمال کو برقرار رکھا لیکن اس میں فاعلی ضمیریں شامل کر دیں اور اس طرح مجہول و معروف کا ایک نیا مرکب تیار کر لیا۔ جیسے کتاب پڑھیم (کتاب پڑھی میں۔ میں نے کتاب پڑھی) اس میں پڑھی کتاب کے مطابق جو مفعول ہے مونث ہے۔ بطور مجہول ہوا اور پڑھی کے ساتھ متکلم کی ضمیر م، فاعلی حالت میں ہے۔ یہ طور معروف ہے۔ قاعدے کے مطابق اسے فاعل (آلی) یا نائب فاعل ہونا چاہیئے۔ اردو میں حالیہ تمام متعدی مجہول کا استعمال بھی دیکھا گیا ہے۔ جیسے وہ مارا یعنی وہ مارا گیا لیکن یہ شاذ و نادر ہے۔

پنجابی نے فعل ماضی کے یہ استعمالات اردو سے لئے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت اردو میں ان استعمالات کی بے قاعدگی اور لہندا میں (جو اصل پنجابی ہے) ان کی ہمواری ہے۔ اس کے علاوہ قدیم حالیہ ناتمام کی ت، جیسا کہ میں نے چوتھے باب میں عرض کیا اردو میں برقرار رہی۔ پنجابی نے اسے د سے بدل لیا۔ کرتا۔ چلتا (اردو) کردا۔ چلدا۔ (پنجابی) ان تفصیلات کے بعد ڈاکٹر گریرسن کی یہ رائے حرف بحرف صحیح معلوم ہوتی ہے[1]:-

"سنسکرت گرامر اہم نقاط میں اس قدیم ہند کی بولی کی نمائندہ ہے جس سے ہندوستانی نے ارتقا پایا۔ سنسکرت گرامر کو سمجھے، ہم اردو کی ساخت کی وضاحت کر سکتے ہیں۔"

---

[1] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج حصہ اول صفحہ ۰۰

پراکرت دور میں دو یا دو سے زیادہ حروف یا حرکات کا اجتماع جائز تھا۔ تلفظ میں اس کو ثقیل، مکروہ، یا ناروا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جدید آریائی زبانوں نے اسے مکروہ سمجھ کر حروف کو گرانا شروع کیا تخفیف کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ ایک حرف گرنے سے کلمے میں جو کمی آئی ماقبل حرکت کھینچ کر اس کی تلافی کر دی گئی۔ جہاں دو حرکتوں یا علتوں کا اجتماع ہوا وہاں دونوں کو ضم کر کے ایک طویل یعنی کشیدہ حرکت یا علت بنا دی گئی یا پہلے ایک حرکت یا علت گرا کر دوسری اس کے عوض میں کھینچ دی گئی۔ حرف یا حرکت کے عوض میں اس طرح طویل حرکت یا علت وجود میں آئی۔ مثلاً (ABBA) میں دو 'ب' جمع ہو گئی تھیں اور (ABAA) میں دو حرکتیں۔ پہلی صورت میں ایک 'ب' گرا کر اس سے پہلے 'A' کو کھینچا تو ABA (آب) بنا۔ دوسری صورت میں آخر سے ایک (A) گرا اور دوسرا طویل ہوا تو (ABA) (ابا) وجود میں آیا۔ پراکرت کے ان کلمات کو، جن میں حروف و حرکات کا اجتماع ہوا تھا۔ اردو اور اس کی ہم سر دوسری نئی آریائی زبانوں نے اس نہج سے کاٹ تراش کر ہلکا بنا لیا۔ پراکرت کے جو کلمے حرکتوں اور حرفوں کے اکٹھا ہو جانے کی وجہ سے ناتراشیدہ اور کسی قدر ان گھڑ ہو گئے تھے اور زبان پر بوجھل اور کان کو ناگوار ہوتے تھے اردو میں آکر بن سنور گئے۔ اردو نے ہر قسم کے حروف و حرکات کا اجتماع ناپسند کیا۔ حرفوں کی گٹھ جوڑ یا کانا پھوسی اس کی طبع نازک کو گراں گزری۔ 'ن' اور حرفِ صحیح کا اجتماع بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ لیکن یہاں 'ن' کو گرانے کی بجائے غنہ کر کے ہلکا کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اسے غنہ کرنے کے بعد ماقبل حرکت کھینچ دی گئی۔ سنسکرت چندر، پراکرت چند، اردو میں چاند ہے۔ اور کھنڈ کھانڈ، دنت دانت، شنڈ سونڈ، بندو بوند۔

پنجابی کو پراکرت کے مشدد حروف بھی گوارا ہوئے۔ 'ن' اور حرف صحیح کا اجتماع بھی اس نے برداشت کر لیا۔ اسی لئے ہتھ۔ کن۔ تن۔ اک۔ کھنڈ۔ منگ وغیرہ کلمے

اس کے یہاں موجود ہے لیکن دو حرکتوں کا اجتماع اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اردو کی طرح دو حرکتوں کو مدغم کر کے یا ایک کے عوض میں دوسری کو کھینچ کر وہ تمام کلمے اس نے وضع کر لئے جو الف پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً گا' 'دا' 'کیتا' وغیرہ ان کلمات کی وضع میں اوپر سمجھا چکا ہوں۔ یہاں 'گا' کی مزید وضاحت کئے دیتا ہوں۔ گت ۔ گد ۔ گ ۔ ے ۔ گا۔

کیا یہ اُردو کا اثر نہیں؟ اگر اردو کے مشدد کلمات پر پنجابی کی چھاپ ہے تو پنجابی کے الف پر ختم ہونے والے کلمات پر اُردو کی مہر لگی ہوئی ہے۔ اب میں دو ایک کلمات کا ذکر کروں گا۔

(۱) آپ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں تعظیمی ضمیر کے طور پر مستعمل ہے جو سنسکرت آتمن اور پراکرت اپن سے لیا گیا ہے۔ اس پر اردو کی چھاپ ہے۔ اس کی ایک 'پ' گرا کر اس سے پہلے الف کو کھینچ دیا گیا۔ قدیم پنجابی میں یہ اپّو تھا۔ ڈاکٹر چیٹرجی کہتے ہیں، یہ لفظ مغربی ہندی (ہندوستانی یا اردو) کے علاقے میں پیدا ہوا۔ وہاں سے دوسری آریائی زبانوں میں پہنچا۔ اس کا تعظیمی استعمال اردو سے لیا گیا ہے[۱]۔

(۲) امر تعظیمی کریے۔ جایئے وغیرہ کی 'یے' کو ڈاکٹر گریرسن اردو سے ماخوذ بتلاتے ہیں۔

(۳) سنسکرت 'جہوا' پراکرت جبّھا اردو میں تخفیف و تسہیل کے بعد جیبھ بنا۔ پنجابی میں بھی جیبھ ہے۔

(۴) سنسکرت مِشٹھا پراکرت میں مِٹّھا ہوا۔ اردو نے میٹھا بنایا۔ پنجابی نے مکّر میٹھ کر لیا۔

(۵) ارِشٹھ، پراکرت رِٹّھا، اردو ریٹھا (یائے معروف)، پنجابی ریٹھا (یائے معروف و تشدید ٹھ)

---

[۱] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۲۰

(۶) سنسکرت کرتہ، پراکرت کتا یا کردا، پنجابی کیتا۔

ان کلمات کی یائے معروف پکار پکار کہہ رہی ہے کہ یہ کلمے تسہیلی رجحان کی پیداوار ہیں، پنجابی نے اردو سے لیے۔ پروفیسر ٹرنر کی رائے بھی یہی ہے[۱]۔

(۷) نینا۔ اسرار فریدی میں ہے: "آپنے نال نہ نیتا"۔ پنجابی نے اردو کے اثر سے یہاں 'ی' ظاہر کرائی اور 'اپنے' کے الف کو کھینچ کر 'آپنے' کر دیا۔

یہ اخذ و استفادے کا پہلا دور تھا۔ اس میں پنجابی، گجراتی، راجستھانی وغیرہ زبانیں قدیم اردو یعنی مغربی ہندی سے متاثر ہوئیں گریرسن کہتے ہیں :-

"درمیانی گروہ کی زبانوں میں مغربی ہندی نمایندہ زبان ہے۔ پنجابی قدیم پے شاچی (جو مغربی پنجابی کی اصل ہے) اور مغربی ہندی کی ماں شورسینی پراکرت کے اختلاط و ارتباط کا نتیجہ ہے۔ راجستھانی جنوب مغرب کی طرف مغربی ہندی کے پھیلاؤ کو پیش کرتی ہے۔ گجراتی اس پھیلاؤ کا انتہائی نقطہ ہے[۲]۔"

دوسرے دور میں اردو نے پنجابی اثر قبول کیا۔ اس کا ذکر میں اس باب میں کروں گا جہاں قدیم اردو اور اس کی مختلف بولیوں پر بحث ہوگی تیسرے دور کا آغاز جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا تیرھویں صدی سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دہلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور دلّی نے برصغیر پاک و ہند کے لئے سیاسی، علمی، تہذیبی، لسانی، ادبی، معاشرتی مختصر یہ کہ ہر اعتبار سے دل کی حیثیت اختیار کی۔ ہر تحریک جو دلی سے اٹھی اس کی لہریں ملک کے دوسرے حصوں تک پہنچیں۔ ڈاکٹر چٹرجی فرماتے ہیں[۳] :-

"دہلی دربار کے اقتدار اور انیسویں صدی میں اردو یعنی مسلمانی ہندی کے قیام و

---

[۱] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۸ صفحہ ۲۲
[۲] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ - حصہ اول - صفحہ ۱۴۳
[۳] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۱۵ -

استحکام کے بعد سے، جو ہندوستان میں اسلامی فکر و تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے، ہندوستانی کو لسانی علاقہ واپس ملا اور اس نے پنجابی اور پشتو تک کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔"

ڈاکٹر گریرسن نے مذکر اسما کے آخری الف اور علامت فاعل (الی) "نے" کو پنجابی سے ماخوذ بتایا تھا میں سطور بالا میں ان پر مفصل بحث کر کے دکھا چکا ہوں کہ پنجابی نے یہ لاحقے اردو سے لیے "کا" علامت اضافت گریرسن کی رائے میں اس زبان کی پیداوار ہے جو کبھی سارے پنجاب پر چھائی ہوئی تھی، اور یہ قدیم ہندوستانی ہے آج کی پنجابی میں اس کا استعمال نہیں ہوتا لیکن بارھویں صدی کے لگ بھگ پنجابی "دا" کے مقابلے میں "کا" زیادہ استعمال کرتی تھی۔ مولانا شیرانی نے بہت سی بستیوں کے نام گنائے ہیں جن میں "کا" ہے۔ یہ "کا" پنجابی نے اردو سے لیا۔ مولانا شیرانی فرماتے ہیں[۱]:۔

"ان مقامات کے ساتھ اردو کی اضافت کا موجود ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اضافات پنجاب میں قدیم الایام سے ہیں اور ایک وقت استعمال میں آرہی تھیں، لیکن جب موجودہ پنجابی کی لہر ملک پر چھا گئی، پرانی زبان کا شیرازہ بکھر گیا۔"

سکھوں کی مقدس کتاب آدگرنتھ میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اس پر قدیم ہندوستانی کی گہری چھاپ ہے۔ گرونانک کے سوانح حیات جنم ساکھی کی تصنیف کا زمانہ ۱۵۶۰ء بتایا جاتا ہے۔ ساکھی کی زبان کے بارے میں ڈاکٹر سدھیشور ورما لکھتے ہیں کہ اس میں ہندی، پنجابی اور لہندا کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ یہ ایک راہرو کی زبان ہے جو اپنی زبان بھول چکا ہے۔ اور جہاں جاتا ہے وہاں کے بسنے والوں کے لسانی ماحول کے مطابق اپنی زبان ڈھال لیتا ہے۔ آر۔ سی۔ ٹمپل نے ۱۸۸۲ء میں پنجاب کے لوک

۱؎ پنجاب میں اردو صفحہ ۲۹۳

گیت شائع کیے تھے۔ ان میں بیشتر گیتوں کی زبان اردو آمیز پنجابی ہے۔ بلکہ بعض تو خیر گیت خالص اردو میں ہیں جو پنجابی پر اردو اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں مولانا شیرانی نے پنجابی اردو کے جو نمونے اپنی کتاب میں درج کیے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے۔ کہ "موجودہ پنجابی کی لہر" آنے سے پہلے پنجاب کی زبان کا رنگ و آہنگ کیا تھا۔ شیخ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ تیرھویں صدی عیسوی کے بزرگ ہیں۔ ملتان کے قصبہ کوتوال میں پیدا ہوئے اور ضلع منٹگمری کے قصبہ پاک پٹن میں ۱۲۶۹ء میں وفات پائی۔ مولانا شیرانی نے ان کے دو چار اقوال تاریخی کتابوں سے انتخاب کر کے لکھے ہیں۔ انہیں میں اوپر کہیں درج کر آیا ہوں۔ وہ خالص اردو میں ہیں۔ مولانا شیرانی ان کے بارے میں لکھتے ہیں[1]۔

"ان فقرات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اردو زبان ساتویں صدی میں اپنے امتیازی خط و خال نمایاں کر چکی ہے"۔

شہاب الدین غوری نے دہلی اور میرٹھ کو ۵۸۹ھ (۱۱۹۲ء) میں فتح کیا۔ اس کے بعد "لاکھوں انسان ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہوئے"۔ اگر یہ لاکھوں انسان پنجابی بولتے ہوئے دہلی گئے تھے۔ اور اس وقت موجودہ اردو کا کوئی ٹھور ٹھکانا نہ تھا تو شیخ فریدالدین کی زبانِ مبارک پر اردو کے وہ فقرات کیسے جاری ہوئے جو اردو کے امتیازی خط و خال نمایاں کرتے ہیں۔ کیا پنجابی زبان دہلی پہنچتے ہی "شدہ" ہو گئی؟ دہلی کی آب و ہوا نے اس کے خط و خال آن کی آن میں بدل دیے؟ مولانا کا یہ فرمانا کہ "اہلِ پنجاب ان ایام میں (چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں کے شروع میں) اردو بول اور سمجھ سکتے تھے" صرف اس صورت میں قابل قبول ہو سکتا ہے جب اردو پہلے سے موجود ہو اور پنجابی سے الگ ایک آزاد اور مستقل زبان کی حیثیت رکھتی ہو۔

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۳۰۱

مولانا نے ذیل کی غزل حضرت بابا گنج شکرؒ کی طرف منسوب کی ہے۔

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
بادمِ خود ہم دم و ہشیار باش — صحبتِ اغیار بری بات ہے
باتنِ تنہا چہ روی زیں زمیں — نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پندِ شکر گنج بدل جاں شنو — ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

یہ خالص نکھری ہوئی زبان اگر بابا فرید کی ہے تو ماننا پڑے گا کہ تیرھویں صدی کے شروع ہی میں اردو دہلی سے ہجرت کر کے پنجاب پہنچ چکی تھی۔

جنم ساکھی میں اردو اثرات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) کھوٹے کو سٹ دیتا ہے (کھوٹے کو پھینک دیتا ہے) صفحہ ۹۵

(۲) اسی ٹانڈے پیر دی ملاقات کو جاتے اہے (ہم تمہارے پیر کی ملاقات کو جا رہے تھے۔) صفحہ ۴۶۵

جملۂ اولیٰ میں سُٹ، صرف ایک لفظ پنجابی ہے۔ باقی پورا جملہ اُردو ہے۔ دوسرے جملے میں "ملاقات کو جاتے" اُردو ہے۔ اس ایک جملے کو چھوڑ کر جس میں ٹانڈے (تمہارے) استعمال ہوا ہے۔ جنم ساکھی میں عام طور سے تیرا، میرا، وغیرہ اُردو کی ضمیریں برتی گئی ہیں۔ جنم ساکھی کے ایک حصے میں گرو نانک کی بابا فرید سے ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ گرو نانک کے ہم عصر بزرگ ہیں جنہیں غلطی سے لوگ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ سمجھتے ہیں۔ اس حصے کی زبان ہندی آمیز پنجابی ہے۔ اس میں پنجابی کے عام رواج کے خلاف فعل متعدی 'وا' کے اضافے سے بنا ہے۔ جیسے سر کپھوایا (سر کٹوایا) اور متعدی المتعدی 'لا' اور 'ا' کے اضافے سے جیسے مکلایا (چھڑایا)

اب میں پنجابی پر اُردو کے وہ اثرات دکھاؤں گا جو کسی قدر جدید ہیں اور

دلی کی مرکزیت کے بعد کی پیداوار ہیں۔

(۱) کس بمعنی کس۔ جیسے۔

کس متر دے کنے ھنسا ہنڑا یہ نہیں پھبنے (گیت ۱۵۶

(۲) کسی بمعنی کسی۔ جیسے۔

اساں جو کسی دیاں نہیں گرجاں (غرضاں) (گیت ۳۱)

(۳) بڑے بڑے بجائے وڈے وڈے۔

کھایاں لبے، بیرا بڑے بڑے گراہیں (گیت ۳۲)

(۴) نچ بجائے وچ۔

ٹبا نچ بھی کرے گڑس (گیت ۱)

(۵) راتیں بڑیاں بجائے راتاں وڈیاں۔

دن تھوڑے راتیں بڑیاں (گیت ۵)

(۶) ہاتھ بجائے ہتھ۔

بنی ڈمہندی گوریاں دے ہاتھ (گیت ۲۱)

(۷) میرا من بجائے ساڈا من۔

میرا من تیں لیا، لج (" ۲)

(۸) لڑکے (بصورت منادی) بجائے منڈیا۔

بے لڑکے، بے لڑکے (گیت ۳۵)

(۹) چھوڑدے بجائے چھڑدے۔

کنجر کھاتے دا جاناچھوڑدے (" ")

(۱۰) پاس بجائے کول۔

توں، تاں رہ اپنیاں سسّو دے پاس (گیت ۴۵

(۱۱) آکھ بجائے آکھو۔

جیہڑے جھٹ پٹ آکھاں نچ (گیت ۵۰)

دے، دیوے دکھائی

(۱۲) باپو بجائے بپّو جیسے آپ بجائے ہپّو۔

اماں جوچھپنی، باپو چھپنی جانی ہاں (گیت ۲۲)

(۱۳) اردو اور پنجابی میں مرکب افعال بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ دو مختلف مصادر کی ترکیب سے مختلف مقاصد کے اظہار کے لیے ایک نیا فعل وضع کرنے کا طریقہ دونوں زبانوں میں رائج تھا۔ پنجابی نے اول اول مصدر کے آخر میں 'ی' بڑھا کر مرکب افعال وضع کیے۔ جیسے بہی جا (بیٹھ جا) چلی رہ (چل رہ) ہنسی پانا (ہنس پڑنا) بعد میں اردو کی دیکھا دیکھی اس نے 'ی' گرا کر سادہ مصادر کی ترکیب سے افعال وضع کرنے شروع کیے۔ قدیم پنجابی سے 'ی' کے اضافے کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

(۱) بہی جا۔ بیٹھ جا

آ، میرے توتو بہی جا پنجریں (گیت ۵)

(۲) رُسی بیٹھنا۔ روٹھ بیٹھنا

مہا دیب رسی بیٹھا منگدا گدو کھرد (گیت ۱۵)

(۳) چلی رہنا۔ چل رہنا

چلی رہیں گے اکیو ساتھ (گیت ۲۱)

(۴) آئی جانا۔ آجانا

سیج بچھائی آئی جا (گیت ۲۳)

(۵) سوئی جانا۔ سو جانا

جہلو سوئی ہیں جانگھا (” ”)

(۶) ہسی پانا - ہنس پڑنا -

توں، تاں ہسی الو، پئی (گیت ۲۶)

(۷) روئی جانا - رو جانا (رو پڑنا)

میتے رلپی گیا (میں رو پڑا) (گیت ۷)

(۸) لئی دینا - لا دینا -

کبھی لو بچ دی لئی دے (گیت ۳۱)

(۹) لی جانا - مل جانا

آئی لی جا (گیت ۳۲)

(۱۰) آئی بیٹھنا - آ بیٹھنا -

آئی بیٹھا ٹھنڈے باگ (گیت ۲۸)

مولانا شیرانی فرماتے ہیں:-

"ہریانی زبان دراصل ایک قسم کی اردو ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں اردو سے اس قدر مختلف نہیں تھی جس قدر کہ آج دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ زمانۂ مابعد میں ہریانی اپنی اصل حالت پر قائم رہی - اردو میں دہلی کے محاورے اور شعرائ کے تصرفات کی بنا پر کثیر تغیرات واقع ہوئے - موجودہ اردو ہریانی کی اصلاح شدہ شکل کا نام ہے۔"

یہ درست ہے کہ ہریانی ایک قسم کی اردو ہے لیکن اس میں شبہ ہے۔ کہ اردو ہریانی کی اصلاح شدہ شکل کا نام ہے - ہریانی اپنی اصلی حالت پر کیوں قائم رہی؟ دہلی کے محاورے کہاں سے آئے اور کس زبان کے ہیں؟ شعرا نے زبان میں تصرفات کیوں کئے اور انہیں یہ حق کس نے دیا؟ ان کے ان تصرفات کو عوام نے کس لئے قبول کیا؟ کیا زبان کبھی انفرادی تصرفات کی بنا پر اتنی بدلی ہے کہ وہ ایک نئی زبان کی شکل میں جلوہ نما ہوتی ہو؟ ان سوالات کا جواب دیئے بغیر مولانا شیرانی

کے مذکورہ بالا نتیجے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

ہریانی کا وجود لسانی اخذ و استفادہ کا رہینِ احسان ہے۔ قدیم اردو نے جمنا عبور کر کے جب مغرب کی طرف قدم بڑھایا تو اس کی مڈھ بھیڑ ایک طرف پنجابی سے ہوئی دوسری طرف راجستھانی کی ایک اہم بولی میواتی سے۔ حصار کا ضلع مغربی ہندی، پنجابی اور راجستھانی کا سنگم تھا۔ جہاں یہ تین بولیاں ساتھ ساتھ بولی جاتی تھیں۔ ہریانی مغربی ہندی (ہندوستانی یعنی اردو) کی نمائندگی کرتی ہے۔ اصلاً وہ اردو ہے، پڑوس کی بولیوں نے اپنے اثر میں لے کر اسے دہلی کی اردو سے مختلف بنا دیا۔ اردو اس کی اصلاح شدہ شکل نہیں، وہ اردو کی مسخ شدہ شکل ہے۔ اس میں دہلی کے محاورات اور شعرا کے تصرفات کی بنا پر تغیرات واقع نہیں ہوئے۔ ہریانی کو پنجابی راجستھانی اثرات نے بدل کر کچھ کا کچھ کر دیا۔ ڈاکٹر گریرسن فرماتے ہیں:۔

" وہ (ہریانی) بالائی دوآبے کی بول چال کی ہندوستانی ہے جسے پنجابی اور راجستھانی عناصر کی آمیزش نے بہت کچھ مسخ کر دیا ہے۔"

ہریانی پر پنجابی راجستھانی اثرات میں سے چند قابلِ ذکر ہیں:۔

(۱) ہریانی کی نمایاں ترین خصوصیت، جو اس نے پنجابی اور راجستھانی سے اخذ کی، یہ ہے کہ وہ اسما کی غیر فاعلی حالت میں 'اں' کے اضافے سے جمع بناتی ہے۔ جیسے: نہاں نے پان سے روپیاں کے داج چھوڑ دیا۔

(۲) راجستھانی کے اثر سے ہریانی میں 'ہے' کی جگہ اور اس کے معنی میں 'سُوں' اور اس کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔

واحد	جمع
سوں۔ ساں	سیں، ہیں، ساں
سے۔ سے	سو

سے ۔ ستے ۔ سیَں ۔ رہیں

(۳) 'ن' کا 'ڑ' سے تبادلہ پنجابی کا اثر ہے

(۴) ہریانی کا میلان 'ڑ' کی جگہ 'ڈ' کی طرف ہے ۔ یہ بھی پنجابی ہی کا اثر ہے جیسے
بڈا (بڑا) پڈھناں (پڑھنا) گدّا (گدھا) ساڈھو (سادھو)

(۵) پنجابی کی ریس میں ہریانی درمیان کے حروفِ صحیح مشدد کر کے ماقبل حرکت
کو کوتاہ کر دیتی ہے، جیسے
چلّیا ۔ کھلّیا ۔ لگّے ۔ بھتّر ۔ بھگّا ۔ کلّ ۔ رجّی ۔ (راضی)

(۶) 'نے' کا مفعولی لاحقے کے طور پر استعمال اگر گجراتی سے نہیں لیا گیا تو پنجابی نُوں
(کو) کے زیر اثر وجود میں آیا ۔ جیسے پردیس نے (پردیس کو)

(۷) ستے (سے) اوہ (وہ) نیڑے (نزدیک) ترن (چلنا) وغیرہ الفاظ پنجابی
سے لیئے گئے ہیں ۔

(۸) پنجابی کی طرح ہریانی صیغہ واحد متکلم 'ں' کے اضافے سے بناتی ہے جیسے
کراں گا (کروں گا)

(۹) اسم حالیہ اور فعل حال میں پنجابی کی طرح 'ت' کی جگہ ہریانی میں 'د' ہوتی ہے ۔
ماردا (مارتا)

(۱۰) ماضی مطلق میں ماقبلِ آخر 'ی' کا وجود پنجابی کا اثر ہے ۔ جیسے من نے ماردیا ۔
(۱۱) 'ں' غنہ پنجابی سے لیا گیا ہے ۔ ماراں (مارنا)، توں (تو) کوں (کو) نیں (نے) ایں
(ہے) وغیرہ ۔

(۱۲) برج کے پڑوس میں واقع ہونے کی وجہ سے ہریانی نے برج کا اثر بھی قبول
کیا ۔ حسب ذیل کلمات کی تسہیل برج ہی کا اثر ہے ۔
ھاڈ (ہڈی)، سانچ (سچ)، کال (کل)، ماٹی (مٹی)، لاگ (لگا)، دوکھ (دکھ)

راکھ (رکھ)۔

ذیل کے کلمات عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات سے اخذ کر کے لکھے گئے ہیں۔

باٹنا (بٹنا)، باندر (بندر)، باندھ (بندھ)، پھوکنی (پھکنی)، ساتو (ستو)، تاپ (تپ)

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ اردو (ہندوستانی) دو آبے کی زبان ہونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ آس پاس کی تمام زبانوں نے اس سے فیض اٹھایا۔ ان میں پنجابی بھی ہے اور راجستھانی و گجراتی بھی۔ ایک لحاظ سے یہ زبانیں اردو کے مختلف روپ ہیں۔ ہریانی ان میں درمیان کی کڑی ہے۔

(۷)

صَرفی، نحوی نشوونما

زبان اپنی فطرت میں تغیر پذیر ہے۔ وہ کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی برابر بدلتی اور زمانے کے بہاؤ کے ساتھ بہتی ہے۔ ٹھیک نہیں کہا جا سکتا کہ زبان کی رفتار ترقی کی گردشِ لیل و نہار سے کیا نسبت ہے۔ زبان کتنی تیزی سے روپ بدلتی ہے مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں[1]۔ "زبان دانوں کا قول ہے کہ ساٹھ برس کے بعد ہر زبان میں ایک واضح فرق پیدا ہو جاتا ہے"۔ اگرچہ مولانا کے اس قول کی چنداں اہمیت نہیں اس میں تحقیق کم اور شاعری زیادہ ہے۔ پھر بھی زبان کبھی ایسے دوروں سے گزرتی ہے کہ اس میں تبدیل اور تغیر کی رفتار تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے اور نصف صدی سے پہلے ہی اس کا حلیہ بدل جاتا ہے۔

اردو بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ ترقی کی راہ اس نے بھی طے کی۔ اسے بھی زمانے کی الٹ پھیر کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ہمارے اہلِ علم نے اردو کے حسب و نسب کی تعیین کرتے وقت اردو کو بدستور زمانے کے بہاؤ کے ساتھ بہتا دکھایا اور

---

[1] آبِ حیات مطبوعہ ۱۹۵۰ء: ص ۱۳۰

اس کی معاصر بولیوں کو ایک منزل پر ٹھہرا دیا[1]۔ اور اس کی وجہ نہ بتائی کہ جب اردو اور اس کی ہمسر بولیوں کے سفر کا آغاز کسی ایک مقام سے ساتھ ساتھ اور قدم بہ قدم ہوا تھا تو کس لئے اُردو منزلوں پر منزلیں مارتی چلی گئی اور اس کی رفیقِ سفر تھک کر بیٹھ رہی اردو نے اپنے جگر گوشے تک نوچ کر اپنے سے الگ کر دیے اور اس رفیقِ سفر (پنجابی) نے اپنے قدیم سے قدیم سرمایہ کو بھی سینے سے چمٹائے رکھا۔

کیا اس لئے کہ "دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اس کی شکل میں تبدیلی ہو جاتی ہے[2]"

یہ خیال کئی وجوہ سے ناقابل قبول ہے۔ اول دو یا دو سے زیادہ زبانیں جب ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو اس میل ملاپ کا اثر صرف ایک زبان پر نہیں پڑتا، برابر برابر دونوں اثر پذیر ہوتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں کے تعمیری عناصر تخریب کی نذر ہو جاتے ہیں[3]۔ اردو برج کی ترمیمیں قبول کرتی رہی لیکن برج نے اردو سے اصلاح نہ لی۔ کیوں؟ دوسرے موجودہ اردو ساخت اور اساس کے اعتبار سے موجودہ پنجابی سے مختلف ہے اگر اردو اور پنجابی کے اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ اردو دہلی جانے کے بعد برج سے وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہی تو اصلاً اسے موجودہ پنجابی سے مختلف نہ ہونا چاہیئے۔ تیسرے اردو کے ان اہم عناصر کی کیا توجیہ ہو گی اور انہیں دہلی کی کس زبان سے ماخوذ بتایا جائے گا۔ جو نہ برج میں ہیں اور نہ پنجابی میں، نہ انہیں پنجابی کہا جا سکتا ہے اور نہ برج سے ترمیم قبول کرنے کا نتیجہ ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ غیرہ علی حالت

---

[1] مولانا شیرانی فرماتے ہیں (پنجاب میں اردو صفحہ ۵)
"اردو اور پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم سے ان میں مشترک تھا۔ اردو زبان سے رفتہ رفتہ خارج ہوتا رہا ہے"

[2] شیرانی:۔ پنجاب میں اردو۔ ص ۷۔

[3] ارل:۔ انگریزی زبان کی لسانیات طبع اول ص ۱۴۔

ہیں" وں" کے اضافے سے جمع بنانے کا قاعدہ نہ پنجابی میں ہے نہ برج میں۔ اُردو میں یہ قاعدہ کہاں سے آیا؟ دہلی کی جس زبان سے جمع کا یہ قاعدہ لیا گیا اُسی اس زبان کی ترقی یافتہ صورت کیوں نہیں ہو سکتی ہے اس نے صرفی نحوی نشوونما کے بعد اختیار کی۔ چوتھے اس ساری بحث میں دہلی اور میرٹھ کے علاقے میں بولی جانے والی (کھڑی) زبان سرے سے نظر انداز ہو جاتی ہے۔ اس زبان کے وجود کو مولانا نے بھی تسلیم کیا ہے اور یہ مانا ہے کہ یہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی۔ یہ دہلی کی وہ قدیم زبان ہے جس سے ارتقا پاکر موجودہ اُردو وجود میں آئی۔ اس پر میں پہلے تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ یہاں مجھے اس مسئلے کے ایک دوسرے دلچسپ پہلو کو لے کر اردو کا صرفی نحوی نشوونما اور فطری ارتقاد کھانا ہے اور اس کے متعلق بعض گمراہ کن غلط فہمیاں دور کرنی ہیں جو بدقسمتی سے اردو دان طبقے میں بہت عام ہیں اور آئے دن پھیلتی جا رہی ہیں۔

مولانا شیرانی مرحوم اردو اور پنجابی صرف و نحو کے عمیق تقابلی مطالعہ کے بعد جس نتیجے پر پہنچے اس کا ذکر انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے[1]۔

"ان زبانوں (اردو اور پنجابی) میں (آج) جو اختلاف دیکھا جاتا ہے وہ اکثر اس وقت واقع ہوا ہے جب اردو کی پرورش شعرا اور تعلیم یافتہ طبقے نے دہلی اور لکھنؤ میں شروع کی ہے"۔ ہریانی اور اُردو کے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں[2]۔

"گیارہویں صدی ہجری میں (ہریانی) اردو سے اس قدر مختلف نہیں تھی جس قدر کہ آج دکھائی دیتی ہے کیونکہ زمانۂ مابعد میں ہریانی اپنی اصلی حالت پر قائم رہی (کوئی زبان اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہتی) اردو میں دہلی کے محاورے (یہ محاورے کہاں سے آئے)

---

[1] پنجاب میں اردو ص، ۱۰۳۔
[2] پنجاب میں اردو ص، ۱۱۔

اور شعراء کے تصرفات کی بنا پر کثیر تغیرات واقع ہوئے۔"

مولانا اردو کے صرفی نحوی نشو و نما اور اس کے فطری ارتقا کو نظر انداز کر کے اردو کے لسانی تغیرات کی ذمہ داری دہلی اور لکھنؤ کے شعرا اور تعلیم یافتہ طبقے پر ڈالتے ہیں۔ مشہور یہی ہے کہ دہلی میں مظہر جان جاناں اور ظہور الدین حاتم نے اردو زبان میں اصلاح و ترمیم کی بنا ڈالی جو لکھنؤ میں ناسخ کے عہد تک جاری رہی۔ اٹھارہویں صدی کے نصف سے انیسویں صدی کے نصف تک اردو میں تراش خراش ہوتی رہی۔ اس سلسلے میں ذیل کے امور اہل علم کی توجہ کے قابل ہیں۔

شعرا کی اصلاح و ترمیم کا تعلق اردو زبان سے نہ تھا۔ شاعری کی زبان یعنی ریختہ تھا۔ حاتم و ناسخ نے اردو کی اصلاح نہیں کی۔ اس زبان کو سنوارا جو ان کے زمانے میں عام طور سے، ان اسباب کی بنا پر جن کا ذکر میں آگے کروں گا، شاعری میں برتی جانے لگی تھی۔ شاہ حاتم نے دیوان زادے کے مقدمے میں اس حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھایا ہے دوسرے یہ اصلاح ان کا ذاتی یا استبدادی فعل نہ تھا۔ وہ اپنی خواہش، پسند اور صوابدید کے مطابق اردو شاعری کی زبان کو نئے قالب میں ڈھالنا نہیں چاہتے تھے، اس انجان بڑھیا کی طرح جس نے شاہباز کی چونچ تراش کر اس کے پنجے قلم کر دیئے تھے اردو میں تراش خراش ان کا منصب نہ تھا۔ اس اصلاح کی ضرورت اس لئے پیش آئی (جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں) کہ دہلی میں اردو شاعری کی داغ بیل پڑی تو دہلوی شعرا کے سامنے دکن کی اردو شاعری نمونہ بنی۔ انہوں نے دکنی شعرا کی پیروی کی اور ان کی تقلید میں زبان بھی وہی اختیار کی جو دکنی شعرا کے یہاں استعمال ہوئی تھی۔ یہ زبان دہلی کی رائج الوقت زبان سے مختلف تھی۔ میرزا مظہر اور شاہ حاتم شاعری کی اس "دکن زدہ" زبان کو دکنی عناصر سے پاک کر کے دہلی کے روزمرہ سے قریب تر لے آئے۔ شاہ حاتم فرماتے ہیں:۔

"روزمرۂ دہلی کہ میرزایانِ ہند و فصیح گویاں ... محاورہ دانند منظور داشتہ" یا یہ

گئے کہ شعرا جانتے تھے کہ جو الفاظ وہ باندھتے ہیں اردو نہیں دکنی ہیں، اور ٹکسال باہر ہیں لیکن جیسا کہ میر انشا اللہ خاں نے لکھا ہے[1] شعری ضرورت سے مجبور ہو کر عمداً شعر میں باندھ جاتے تھے۔ نثر میں مجبوری نہ تھی اس لیے یہ غیر محلل الفاظ نظم میں جڑ پکڑ گئے نثر میں راہ نہ پا سکے۔ مصلحینِ زبان نے ان الفاظ کے خلاف جہاد کر کے ریختہ کے باغ کو جو دکنی الفاظ کے خس و خاشاک سے اٹ گیا تھا پاک کیا۔ انشاؔ فرماتے ہیں[2]:-

"میں ان صاحبوں کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے کئی نامعقول الفاظ ترک کر دیئے۔ جیسے 'منے' بمعنی بیس (درمیان) پہلے یہ لفظ شعروں میں آتا تھا، جیسا کہ میاں آبرو نے کہا ہے"

بر منے جامہ نہ تھا اک جھول تھی"

مصلحین شعرا کی اصلاح کا دائرہ الفاظ و مرکبات تک محدود رہا، اس سے آگے نہ بڑھا۔ ذیل کے الفاظ شاہ حاتم نے متروک قرار دیئے ہ۔

(۱) 'دل'، 'بر'، 'اور' و دیگر الفاظ و افعالِ فارسی۔

(۲) الفاظ ہندی مثل 'نین' و 'جگ'۔

حسب ذیل الفاظ میں انہوں نے ترمیم کی:-

(۱) تسبی کو تسبیح، صحی کو صحیح، بگانہ کو بے گانہ، دوانہ کو دیوانہ۔ مرض (بسکون اوسط) کو مرض (بفتح اوسط)

(۲) ستی کو سے، اودھر کو ادھر، کیدھر کو کدھر، یاں کو یہاں۔ واں کو وہاں لکھا۔

قریب قریب یہی حال میر و مرزا کی اصلاحات کا ہے۔ ان شعرا نے عربی و فارسی الفاظ کو ترک کیا جن میں شعری ضرورت کی بنا پر کسی قسم کا ناجائز استعمال

---

[1] ترجمہ دریائے لطافت، ص: ۵۸

[2] ترجمہ دریائے لطافت ص: ۵۹

زبان کے مزاج کے خلاف کوئی تصرف ہوا تھا، مثلاً متحرک کو ساکن، ساکن کو متحرک، مشدد کو مخفف، مخفف کو مشدد، مذکر کو مؤنث، مؤنث کو مذکر کر لیا گیا تھا، یا ان کا تلفظ اصلی زبان کے تلفظ کے مطابق نہ تھا، ان میں کوئی حرف زیادہ یا کم کر دیا گیا تھا، یا وہ الفاظ پنجابی، یا دکنی یا برج سے اردو میں چلے آئے تھے اور اردو نہ بنے تھے، یا ان کی شکل اور تلفظ اس [illegible] تلفظ کیا جاتا تھا [illegible] تھے جیسے صفیر بلگرامی نے متروکات سخن کی جو فہرست جلوۂ خضر میں درج کی ہے اس پر ایک نظر ڈالتے ہی ہمیں اس قول کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

مولانا شیرانی کا ارشاد ہے:[1]

"انھوں نے (اردو شعرائے) اپنی دانست میں اردو کی اصلاح کی مگر اکثر مواقع پر دیکھا جاتا ہے کہ ان کی اصلاح و ترمیم کے اصول نے ایک صرفی کے نقطۂ نظر سے زبان کے قواعد میں ابتری و برہمی پیدا کر دی ہے۔ قدیم اصول جن پر زبان کی تعمیر ہوئی تھی جامع مفید اور کارآمد تھے۔"

اصلاح و ترمیم کی مثالیں حسب ذیل مثالیں پیش فرماتے ہیں:[2]

"پرانی جمع کے قاعدے کو انھوں نے بالکل بیکار اور باطل کر دیا۔ اقلیم زبان سے حرف علت و نون غنہ کے اخراج میں ہم ان سے متفق ہو سکتے ہیں۔ لیکن افعال و اسمائے جمع مؤنث کے ترک کرنے میں ہرگز ہرگز حق بجانب نہیں۔ اس نے زبان سے موسیقیت اور خوش آہنگی کے ایک بڑے عنصر کو برباد کر دیا ہے۔"

اردو شعرائے پرانی جمع کے قاعدے باطل کئے اور نہ اقلیم زبان سے حرف علت اور ں، غنہ کو نکالا یہ سب کچھ زبان کی تغیر پذیر اور نمو پذیر فطرت کے اندرونی تقاضوں کے اثر سے ہوا۔ مسلمانوں کی سرپرستی میں آنے سے پہلے اردو دہلی اور اس کے نواح میں بولی

---

[1] پنجاب میں اردو ص ۱۰۳

[2] 〃 〃 〃 ص ۱۰۳

جارہی تھی۔ اگرچہ اس کی شکل وہ نہ تھی جو آج ہے۔ یا مسلمانوں کی سرپرستی میں آنے کے بعد ہوئی۔ اپنی زندگی کے قدیم عہدوں میں اس نے نت نئی صورتیں بدلی تھیں، نئے دور میں قدم رکھنے کے بعد بھی وہ نئے نئے روپ دھارتی رہی۔ زبان کی نت نئی تبدیلیوں کا ذمہ دار اردو شعرا اور تعلیم یافتہ طبقے کو ٹھہرانا حقیقت کے خلاف ہے۔ قیاس صحیح اس کا موید نہیں حقیقت کے خلاف اس لئے کہ شعرا مصلحین کے کارناموں کی تفصیلات تذکروں میں مرقوم ہیں۔ ان میں صرفی نحوی اصلاحات شامل نہیں۔ اگر شعرا صرفی نحوی اصول و قواعد میں ترمیم و اصلاح کرتے تو تذکرہ نگاروں کی نظریں اس پر ضرور پڑتیں اور وہ اس کا ذکر کرتے۔ قیاس سے اس دعوے کی تائید نہیں ہوتی کہ صرفی اصول کی اصلاح و ترمیم یا ان میں کسی قسم کا تصرف شعرا یا تعلیم یافتہ طبقے کے اختیار و اقتدار سے باہر ہے۔ ان کا ہاتھ زبان کے دامن تک نہ پہنچ سکا۔ اس کے کریاں پر کیا ہاتھ ڈال سکتے تھے۔

اردو کے صرفی نحوی اصول و قواعد میں وقتاً فوقتاً ترمیمیں ہوئیں اس میں شبہ نہیں۔ شبہ اس میں ہے کہ یہ ترمیمیں شعرائے اردو کے ہاتھوں عمل میں آئیں۔ میں کہتا ہوں زبان کی فطرت ہے کہ وہ زمانے کی ہر کروٹ کے ساتھ کروٹ بدلتی رہی ہے۔ مولانا جسے زبان کے قواعد میں ابتری و برہمی بتاتے ہیں، جدید دبستانِ لسانیات کا امام یسپرسن اسے زبان کی برتری، تفوق اور اصلاح کی ایک اچھی اور صحت مند علامت قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے زبان کے بارے میں جو بحثیں کی گئیں وہ بیشتر لاطائل اور بے سود ہیں۔ ان سے کوئی علمی نکتہ دریافت نہیں ہوا۔ اصل سوال جس کی کوئی اہمیت ہے یہ ہے کہ زبان میں تغیر کا رخ ترقی کی طرف ہے یا تنزل کی طرف؟ زبان روپ بدل کر آگے بڑھتی ہے یا پیچھے ہٹتی ہے؟ اس میں ابتری و برہمی رونما ہوتی ہے یا برتری و ہمواری یسپرسن کہتا ہے[1] کہ مختلف زبانوں کے تاریخی ارتقا کے جائزے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صرفی نحوی اصول کے لحاظ سے

---

[1] انگریزی زبان کی ساخت اور نشو و نما طبع سوم ص ۱۲،۱۳

زبان کا عام و فطری میلان ہے کہ وہ ابتری سے برتری کی طرف قدم بڑھائے اور ناہمواری (CHAOS) سے ہمواری (COSMOSY) کی طرف قدیمی اصولوں کو جن پر زبان کی تعمیر ہوئی جامع، مفید، اور کارآمد بتانا جدید نظریہ ارتقا کے منافی ہے۔ اس سے اس نتیجے کی تکذیب ہوتی ہے جس پر جدید لسانیات کے ماہر تحقیق، جستجو اور کاوش کے بعد پہنچے۔ زبان کے قدیمی اصولوں کی جامعیت اگر ان کی کثرت (RICHNESS) وسعت، رنگارنگی اور تنوع ہے، تو ہو سکتا ہے وہ اصول جامع ہوں، لیکن اس میں شبہ کی گنجائش ہے کہ وہ اصول مفید اور کارآمد تھے۔ اگر وہ مفید ہوتے تو تدریجی تخریب نہ ہوتے۔ مفید اور کارآمد چیزیں مٹتی نہیں باقی رہتی ہیں پانی کے اوپر کے جھاگ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو جاتے ہیں۔ اور سمندر کی تہہ میں بیٹھ جانے والے موتی جو نفع بخش اور کارآمد ہیں، باقی رہ جاتے ہیں۔ زبان کے قدیمی اصول جن کے ضائع ہو جانے کا مولانا کو افسوس ہے سرے سے بے سود اور غیر مفید تھے۔ اگر مفید تھے تو انسان کی ذہنی و فکری نشوونما کی وجہ سے اپنی افادیت کھو چکے تھے۔ اور حرام گوشت کی طرح زبان کے نمو پزیر جسم سے چمٹے ہوئے تھے۔ زمانے کے بے رحم ہاتھ نے اس حرام و بے جان گوشت کے لوتھڑے کو زبان کے جسم سے نوچ کر الگ کیا۔ مشہور جرمن ماہر لسانیات کراٹر (KRAUTER) کہتا ہے[1]

"قدیم صیغوں، اصولوں اور آوازوں کے نقوش دھندلے ہوتے اور مٹتے دیکھ کر دل غم و غصے سے بھر جاتے ہیں لیکن انصاف پسند جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی نہیں جانتا ہے کہ یہ ارتقا کی جیت ہے جو اس نے مردہ اور بے جان مواد پر حاصل کی"۔

مولانا پرانی جمع کے قاعدے کو زبان کی موسیقیت اور خوش آہنگی کا ایک بڑا عنصر قرار دے کر فرماتے ہیں "کیا کوئی شخص مرزا سودا کے ان اشعار کی خوشنوائی سے انکار کر سکتا ہے، جو پرانی طرز میں لکھے گئے ہیں۔

---

[1] بحوالہ لیسپرسن "زبان میں ارتقا" طبع دوم ص، ۱۵۔

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک ہائیں تری کرنی نہ بھلیاں دیکھیاں
وہ رہا دست تأسف کے تئیں ملتا ہوا
جن نے وہ انکھیاں خمار آلودہ ملیاں دیکھیاں

مولانا زبان کے پرانے از کار رفتہ تکلفات کو زبان کے قواعد کا زیور سمجھ کر سودا کے مندرجہ بالا اشعار کی خوشنوائی پر سر دھنتے ہیں۔ اردو کا جملہ :-

"مرنے والی لڑکیوں کی مائیں روتی کہتی تھیں"

جب قدیم اردو قواعد کے مطابق اس طرح لکھا جاتا ہے :-

"مرنے والیاں لڑکیاں کیاں مائیاں روتیاں روتیاں کہتیاں تھیاں"

تو انھیں ایک حسین گلدستہ نظر آتا ہے۔ مولانا زبان کے جن تکلفات کو قواعدِ زبان کا زیور سمجھتے ہیں، بیان کے قریب قریب اسی نوع کے تکلفات کبھی اسالیب بیان کی زینت سمجھے جاتے تھے۔ مولانا زبان کی موسیقیت و خوش آہنگی پر فریفتہ ہیں۔ لوگ بیان کی خوش نوائی اور نغمہ سرائی پر ریجھے ہوئے تھے۔ نقطۂ نگاہ ایک ہی ہے۔ یعنی مقصد سے زیادہ ذریعے کی اہمیت، اور جوہر کو نظر انداز کر کے زیور سے لگاؤ۔ زبان خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے مقصد، اظہار ہے زبان نہیں، بیان ہے طرزِ بیان نہیں۔ زبان خوش آہنگ ہے اگر مقصد کا سیدھی طرح اظہار کر دے، طرزِ بیان دلنشین ہے اگر وضاحت اور صفائی کے ساتھ دل کی بات دل تک پہنچا دے، راسک کہتا ہے[۱] :-

"جامع لسانیاتی ساخت جو اسماء و افعال کے رنگا رنگ لاحقوں پر مشتمل ہو، اپنے اندر بڑی افادیت رکھتی ہے . . . لیکن اس کے مقابلے میں سادگی اور آسانی کے فوائد بھی ہیں، جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا"

---

[۱] بحوالہ "زبان میں ارتقا، ص ۱۴۱

یسپرسن لکھتا ہے:۱؎

"قدیم زبانوں کے برائے نام جامع اور متنوع قاعدے اور اعرابی لاحقے زبان کا حسن نہیں عیب ہیں، جنہوں نے زبان کے چہرے کو بھدا اور داغدار کر دیا ہے۔"

اس سلسلے میں فان ہم بولٹ کا یہ قول بھی توجہ کے قابل ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان کا حسن اس کی سادگی اور الھڑپن میں ہے۔ زبان وہی حسین و دل نشیں ہے جو اپنے مقصد یعنی اظہارِ خیال میں کسی رکاوٹ اور پیچیدگی کے بغیر بولنے والے کی مدد کرے۔

"زبان کے معنی ہیں گویائی اور گویائی انسان کا تہذیبی عمل ہے جس کے ذریعے وہ اپنا ما فی الضمیر کسی دوسرے انسان تک پہنچاتا ہے۔ زبان وہی بلند مرتبت ہے جو کم سے کم ذرائع کی مدد سے اپنا یہ مقصد پورا کر دے۔ یا یوں کہیے کہ جو زیادہ سے زیادہ مطالب کا اظہار کم سے کم الفاظ اور سادہ سے سادہ اصول میں کر سکے"۲؎

یسپرسن کے حوالے سے یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قریب قریب ہر زبان میں تبدیلی کا رُخ سادگی اور آسانی کی طرف ہے۔ یسپرسن کہتا ہے کہ آریائی زبانوں کے قدیم ادوار کا جدید ادوار سے مقابلہ کرنے پر پتا چلتا ہے کہ زبان کے جدید ادوار کی صرفی شکلیں مختصر، کمتر، سادہ، باقاعدہ اور کسی قدر عام ہیں۔ اس کے مقابلے میں قدیم دور کے صیغے اور ان کی صورتیں طویل اور پیچیدہ، بے قاعدہ اور متعین ہیں۔ یہ اصول تمام زبانوں میں تفاوتِ درجات کے ساتھ کار فرما رہا ہے۳؎۔ آئیے اس اصول کو سامنے رکھ کر اردو کے صرفی نحوی قواعد کا جائزہ لیں۔

سب سے پہلے اختصار کو لیجیے۔ اردو روزِ اول سے "ہر چہ گیرید مختصر گیرید" پر عامل رہی ہے۔ دسویں صدی عیسوی سے پہلے وہ اپ بھرنش دور میں تھی تو اس کے اسماء،

۱؎ بحوالہ "زبان میں ارتقا" ص ۱۴
۲؎ بحوالہ "زبان میں ارتقا" ص ۱۳
۳؎ زبان میں ارتقا ص ۱۲۲

افعال، حروف، اسمی و فعلی لاحقے، جن سے تعمیر الفاظ کا کام لیا جاتا ہے، طویل الذیل واقع ہوئے تھے۔ ان میں چند دسویں صدی کے بعد کے دور میں بھی رستے جوگی کی طرح چلے آئے ہیں بعد میں چھٹے۔ "کا" قدیم ارعد میں "کیرا" تھا۔ پہلے "کیر" ہوا اس کے بعد "کر"۔ کبیر اور تلسی نے "کر" استعمال کیا ہے۔ "ک" (الف علامت تذکیر ہے) اس کی آخری شکل ہے۔ مزید کانٹ چھانٹ کی گنجائش نہیں ورنہ شاید اور ترشتا۔ "ہے" اور "تھا" اردو کے دکنی دور میں "اہے" اور "اتھا" تھے۔ ان کا الف نذر تخفیف ہوا۔ "جگہ" غالباً "جائے گاہ" کی تراش ہے جو "جاگہ" ہوتا ہوا "جگہ" بنا۔ متقدمین شعرا کے دورِ دوم تک دہلی میں عام طور سے "جاگہ" ہی بولا جاتا تھا۔ خواجہ میر درد فرماتے ہیں:-

چلئے کہیں اس جاگہ کہ ہم تم ہوں اکیلے
گوشہ نہ ملے گا کوئی میدان ملے گا

"لاگا" (لگا) کا بھی یہی حال ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں:-

خون جگر ہو بہنے لاگا پلکوں ہی پہ رہنے لاگا

کیدھر، جیدھر، ایدھر، اودھر وغیرہ کلمات کی "ی" اور "و" کی حیثیت "لاگا" اور "جاگہ" کے الف کی سی ہے۔ ان حروف کی بابت مولانا شیرانی فرماتے ہیں۔ "اقلیم زبان سے ان کے اخراج پر ہم متفق ہیں۔ "جاگہ" کو چھوڑ کر باقی کلمات کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ ان کے حروفِ علت ا، ی، و اصلی ہیں۔ میر انشاء اللہ خاں کی رائے[1] ہے کہ یہ حروف بعد کی پیداوار ہیں اور شاید اس زمانے کا طرزِ تحریر ان کی تخلیق کا ذمہ دار ہے۔ قدیم زمانے میں بعض کاتب کتابت میں ضمہ کی رعایت سے "و" اور کسرہ کی رعایت سے "ی" لکھ دیا کرتے تھے۔ اول اول بولنے میں "ی" اور "و" دبے رہے، بعد میں ان کا اعلان ہونے لگا۔ اس لئے حاتم وغیرہ شعراء مصلحین کو اس طرزِ کتابت اور طرزِ تلفظ کے خلاف جہاد کرنا پڑا۔

---

[1] ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۰۷

'تک' اردو کے اختصار پسند رجحان کی اچھی مثال ہے۔ یہ آج سے تقریباً چار سو سال پہلے 'تولگن' تھا 'سب رس' میں ہے۔ "جو لگن بشریت اس میں باقی ہے تو لگن اگا اللہ لہنے کی مشتاقی ہے" (ص ۱۰۹) 'تو لگن' سے 'تونگ' ہوا پھر 'تب لگ' اس کے بعد 'تلک' تلک اور 'تک'۔ 'تو' قدیم زمانے میں 'تاوت' تھا۔ 'تاؤ۔ تو' اس کے درمیانی صیغے ہیں۔ ایک شکل اس کی 'تب' ہے۔ "تب بھی" کی جگہ اور ان کے معنی میں "توبھی" (بفتح 'ت' و سکون 'و') آج بھی مستعمل ہے۔ "اگر" "یہ بات تسلیم کرلی جائے.... تو بھی میرے نزدیک" (مضامین حالی ص ۲۴۵)

قدیم دکنی اردو میں ماضی معلق یائے مخلوط کے ساتھ مستعمل تھی۔ دکنی شعراء نے چلا، پڑھا، دیکھا کو چلیا، پڑھیا، دیکھیا ہی باندھا۔ دہلی کے قدیم شعراء خسرو، افضل اور برہمن کے یہاں مجھے ماضی کی 'ی' نہیں ملی لیکن اس کے کئی قرینے ہیں کہ قدیم اردو میں 'ی' تھی جو اردو کی طبع نازک پر گراں ہونے کے باعث بعد میں گر گئی۔ 'کیوں' اور 'کیا' وغیرہ دو چار کلموں میں بچ رہی تاکہ 'کیوں' 'کوں' سے مشتبہ نہ ہو جو کبھی اردو میں 'کو' (لاحقہ مفعول) کی ایک شکل تھی اور 'کیا' 'لاحقہ اضافی' 'کا' سے۔

مولانا شیرانی کا ارشاد "یائے مخلوط قدیم زمانے میں اردو میں ملتی تھی لیکن اب متروک ہے" درست ہے۔ میر نے عربی لفظ 'خیال' کی 'ی' کو 'خ' کے ساتھ ضم کرکے 'خیال' (بروزن فاع) باندھا اور بقول مولانا آزاد اسے اردو محاورہ قرار دیا۔ لیکن آج کل خالص ہندی الفاظ پیار اور پیاس جو اصلاً مخلوط التلفظ ہیں، اعلان 'ی' کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ آج یہ اردو کی فطرت ہے بیونتنا (جسم کے مطابق کپڑا قطع کرنا) ۱۸۰۳ء تک مخلوط التلفظ اور بہار و یوپی کے مشرقی اضلاع میں آج بھی مخلوط ہی ہے، لیکن اہل اردو اس کا قدیم تلفظ ترک کر چکے ہیں، اور 'بولیا' کی 'ی' کا سا سلوک کرکے بوتنا بولتے ہیں اگرچہ لکھتے بیونتا ہی ہیں۔

قدیم اردو کے بہت سے کلمات کے آخر میں 'ں' غنّہ ہوا کرتا تھا یہ 'ں' کہاں سے آیا اور کن حالات میں آیا اس وقت یہ زیر بحث نہیں۔ اس کا ذکر میں اپنے تحقیقی مقالے میں کر چکا ہوں۔ یہاں یہ بتانا ہے کہ یہ 'ں' بے جان تھا اور امتداد زمانہ کے ساتھ سے اپنی افادیت ضائع کر چکا تھا۔ اس لئے نیرنگی دوراں کی نذر ہوا۔ اردو والے 'نے' 'کو نیں' 'سے' 'کو سیں' 'کو' 'کو کوں' 'کہنا' 'کو کہناں' بولا اور لکھا کرتے تھے۔ انشاء کہتے ہیں:؎

"یہ شاہ جہاں آباد کی زمین کا فیض ہے کہ کلمے کے آخر سے 'ں' غنّہ کا دُم چھلا اڑ گیا ورنہ سادات بارہہ کے پراتم بزرگ جو اپنے وطن میں رہے۔ 'کو' 'کو کوں' بولتے ہیں۔"

پرانی جمع کے قاعدے کی بابت مولانا فرماتے ہیں کہ "اسے باطل اور بے کار کر دیا گیا"

پرانی جمع کے قاعدے سے ان کی مراد شاید لاحقہ 'اں' ہے۔ دکن میں عام طور سے اور دہلی میں اردو شاعری کے باقاعدہ آغاز سے پہلے مذکر و مؤنث کی جمع 'اں' کے اضافے سے بنتی تھی۔ جیسے باتاں، اجاڑاں، عمراں، بھائیاں، مائیوں۔ جمع کا یہ قاعدہ پنجابی، سندھی، مارواڑی، مشرقی ہندی میں بھی ہے۔ اور اس لحاظ سے قدیم ہے کہ اس کا جوڑ سنسکرت لاحقہ جمع (بے جنس) 'آنِ' ("اانِ" ہ مکسور) سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اردو کے گہرے تاریخی مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'اں' کی جمع اردو میں 'وں' کی جمع سے زیادہ قدیم نہیں۔ اس کی واضح اور ناقابل تردید شہادتیں درج ذیل ہیں۔

(۱) سید محمد حسینی گیسو دراز کا رسالہ معراج العاشقین دکنی ادب کی دریافت شدہ کتابوں میں سب سے زیادہ قدیم ہے۔ اس میں ایک مقام پر (ص ۲۰) کان کی جمع کانوں ('وں' کے ساتھ) استعمال ہوئی ہے۔

(۲) دکنی شعرا کے یہاں لاحقہ 'اں' کے پہلو میں 'وں' بھی ملتا ہے۔ محمد امین

؎ ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۱

دکنی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

وہ دوزخ کی اگن کو رب نے دھوئی — کئی لاکھوں براں جل میں ڈبوئی

اس میں براں (جمع برس بمعنی برس) کی صفت لاکھوں (جمع لاکھ باضافہ وں) استعمال ہوئی ہے 'براں' کی صحبت میں 'لاکھاں' یہاں زیادہ خوش آہنگ تھا۔ لیکن شاعر نے لاکھوں استعمال کیا۔

قدیم اردو اور پنجابی میں اسمائے عامہ یعنی ضمائر، اشارات، موصولات، کنایات حروف استفہام کے جمع کے صیغے بول چال اور تحریر کی زبان میں اس وقت استعمال ہوتے تھے جب کثرت پیش نظر دیا جاتا تھا۔ یا مجموعۂ اشیاء اور جمعیت افراد کا اظہار مقصود ہوا کرتا تھا یہ طریقہ قدیم سے ان زبانوں میں رائج چلا آرہا تھا۔ اردو کی پرانی کہاوت ہے "چار یار چاروں بیکار" اردو والوں نے مجموعی حیثیت جتلانے کے لئے 'چار' کی جمع بنائی۔ انگریزی میں یہی بات کہنا چاہیں تو ALL وغیرہ کوئی لفظ اضافہ کر کے کہیں گے (ALL THE FOUR) سب معنی جمع ہے اور کثرت و تعدد کا اظہار کرتا ہے۔ اردو میں سبھوں (قدیم زمانے میں سب کا تلفظ سبھ کیا جاتا تھا) اس کی جمع ہوئی۔ کہتے ہیں کہ [1] "سبھوں نے مل کر چھپر اٹھایا"۔ اس کے علاوہ حسب ذیل دوسری جمع کے صیغے اردو میں ہیں :۔

انہوں (جمع اُن)، اِنھوں (جمع اِن)، جنھوں (جمع جن)، کنھوں (جمع کن)

کسی زمانے میں یہ صیغے مغیرہ حالت میں عام طور سے مستعمل تھے۔ اہل اردو کہا کرتے تھے۔ "جنھوں کے واسطے ہم نے جان دی۔ انہوں کو ہم خوب جانتے ہیں" لیکن آج ان صیغوں کا یہ استعمال اردو روزمرہ کے خلاف ہے۔ آج یہ صیغے صرف "نے" کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ سے، کو، کا، پر وغیرہ کے ساتھ ان کا استعمال صحیح نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ صیغے 'ں' پر ختم ہوتے ہیں۔ ان پر 'ے' بڑھا کر ان سنے، جو بنے۔

---

[1] الشا 'سبھ سنے' کی جگہ سبھوں نے مغل پورے والوں کی زبان بتاتے ہیں ص ۲۵

کہیں تو اشتباہ ہوتا ہے کسی زمانے میں 'اس نے' اور 'جس نے' 'کونس' اور 'ن' کے ادغام کے بعد لتے اور جنے کہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دو نون ہم کا اجتماع پسندیدہ اور مستحسن نہیں۔ کو کا وغیرہ حروف مغیرہ ان کلمات پر اضافہ کر کے 'بن کو' یا 'جن کا' یا 'جن سے' ان کو 'ان کا' 'ان سے' لکھنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ اس لیے 'نے' کے ساتھ قدیم جمع کے صیغے برقرار ہے۔ 'کو' 'کا' وغیرہ حروف کے ساتھ ان میں تخفیف کر لی گئی۔

بہرحال ان صیغوں کی یہ بناوٹ بھی پرانی ہے اور اغلب یہ ہے کہ جس زمانے میں ان کلمات پر "وں" بڑھایا گیا اردو اور پنجابی میں 'اں' زیادہ مکر نے کا رواج نہ تھا۔ ان کلموں پر اس نہیں بڑھا یہ اپنی قدیم شکل ہی میں رائج رہے۔ پاس پڑوس کے الفاظ کی صحبت نے بھی انہیں متاثر نہ کیا۔ احمد دکنی کے مذکورہ بالا شعر میں 'بہاں' کے پہلو میں 'لاکھوں' استعمال ہونے کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ 'لاکھوں' اردو میں اس وقت بھی تھا جب 'بہاں' نے جنم نہیں لیا تھا۔ وہ مدت سے 'وں' کے ساتھ استعمال ہو رہا تھا۔ بولنے والے اسے واحد سمجھا کیے اور یہ بھول گئے کہ وہ جمع کا صیغہ ہے جسے 'وں' بڑھا کر وضع کیا گیا ہے ورنہ بہاں کے قیاس پر اس کی جمع بناتے۔

'ہم' کی جمع 'ہموں' اور 'تم' کی جمع 'تموں' (تم اصل میں 'تمھ' تھا) انہیں کے قیاس پر اردو قاعدے اور اس کے مزاج کے مطابق بنائی گئی۔ امین دکنی کہتا ہے:۔

ہموں سنے دیکھ کر اس گھاؤ کھائی۔

'ہمن' اور 'تمھن' یہ بھی قاعدے سے بنیں۔ چندربھان برہمن کا شعر ہے:۔

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے\
نہ دلبر ہے، نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

سعدی کاکوروی کہتے ہیں:۔ ہما تمھن کو دل دیا۔ تم دل لیا اور دکھ دیا\
ہم یہ کیا تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پیت ہے

مولانا شیرانی فرماتے ہیں[1]: "ہم کی شکل ہماں، ہموں اور ہمیں ہونی چاہیے لیکن ہماں نہ آج ملتا ہے نہ پرانے شعرا میں، ہموں، متاخرین نے ترک کردیا۔ ہمیں خدا کے فضل سے آج بھی زندہ و سلامت ہے۔" ہموں اور ہمیں دیائے مجہول، میں بڑا فرق ہے ہموں، ہم کی جمع ہے جسے 'وں' بڑھا کر وضع کیا گیا۔ اس کی نوعیت وہی ہے جو 'انہوں' اور 'جنھوں' کی ہے 'ہمیں' 'ہم' کی مفعولی (ثانوی) حالت ہے۔ 'یں' اس میں مفعولی ہے 'ے'، 'مجھے' 'تجھے' 'اُسے' وغیرہ مفرد ضمیروں میں بھی ہے[2]۔ 'ہماں' مولانا کو پرانے شعرا کے یہاں اس لئے نہیں ملا کہ جب 'ہموں' وضع ہوا تو 'ان' کی جمع کا قاعدہ نہ تھا۔ یہ قاعدہ اُردو کا قدیمی قاعدہ نہیں، بعد کی پیداوار ہے اور باہر سے لیا گیا ہے۔ فارسی کے اثر سے یہ اُردو میں آیا۔ اول اول اہلِ اردو نے اس کو عربی فارسی الفاظ تک محدود رکھا اور فارسی قاعدے کے خلاف صفت یا اضافت کے بغیر فارسی و عربی الفاظ کی جمع 'اں' سے بنائی جیسے:-

گل بچارتیں سن کے حبیب کردیں بلبلاں صدا

ہاتھ سے جاتا رہا دل دیکھ محبوباں کی چال

زلفِ خوباں کی ہوئی ہے مرے جی کو جنجال

اہلِ دکن نے غالباً راجستھانی کے زیرِ اثر اس قاعدے کو عام کردیا۔ وہ ہندی لفظوں پر بھی یہ عمل کرنے لگے۔ اور پہاڑ کی جمع پہاڑاں، بات کی جمع باتاں بنانے لگے عطف و اضافت کے باب میں بھی انہوں نے یہی کیا تھا، اور حدود کی رعایت نہ رکھ کے ہندی و فارسی (یا عربی) لفظوں کے مابین عطف و اضافت کا اصول برتا تھا۔

---

[1] پنجاب میں اردو ص ۱۴۳

[2] اس مقام پر مولانا نے یائے معروف اور یائے مجہول میں فرق نہیں کیا اور کڑھیں، نہیں وغیرہ کو جن میں یائے معروف ہے 'ذاتیں' اور 'ہیں' کے 'ہم وزن اور مساوی قرار دیا۔ 'لڑکیں' اور 'ہیں' اگرچہ ہم وزن ہیں۔ دونوں میں لاحقہ 'یں' ہے لیکن 'ہمیں' کا لاحقہ مفعولی ہے۔ اور 'لڑکیں' کا جمعیت کے لئے۔

اُردو میں 'ں' کے عام طور سے رواج پا جانے کے بعد جمع کے قاعدوں میں "بھرتی" اور ایک طرح کی ابتری رونما ہوئی۔ کہیں 'وں' سے جمع بنائی گئی کہیں 'اں' سے کہیں 'یں' سے اور کہیں حرف 'ے' سے۔ یہ زبان کی سادگی اور اصول پسند مزاج کے خلاف تھا۔ اردو نے اس میں کانٹ چھانٹ کی۔ اصول انتخاب کو برتا، باقاعدگی پیدا کی جو زبان کا اصلی جوہر ہے 'اں' 'ی' پر ختم ہونے والے مونث اسمائے کے ساتھ مخصوص ہوا۔ باقی مونث اسما کی قائم حالت میں 'یں' سے جمع بنی اور مذکر اسما کی محض 'ے' سے بشرطیکہ وہ الف پر ختم ہوں۔ "محل" ہر اسم کو برابر برابر حصہ ملا۔ تمام اسما مذکر ہوں یا مونث، الف پر ختم ہوئے ہوں یا 'ے' پر مغیرہ حالت میں 'وں' کے اضافے سے جمع بنائے گئے۔ یہ اردو کا کلیہ قاعدہ ہے۔

اس کے ساتھ ہی اردو نے ان تمام صیغوں کو چھانٹ دیا جن کا کوئی مصرف نہ تھا یا جو زبان کے ارتقا کی وجہ سے اپنی افادیت کھو چکے تھے اور بے جان ہو گئے تھے دونوں، تینوں کے قیاس پر متقدمین کے عہدِ اول میں ایک لفظ 'ایکوں' وضع ہوا تھا۔ میر صاحب فرماتے ہیں:-

ایکوں کی کھال کھینچی ایکوں کو دار کھینچا

یہ لفظ قلمروِ زبان سے خارج ہوا۔

کنھوں سے، کنھوں کو، پر خطِ تنسیخ کھنچا، کن سے، کن کو، ان کے مقابلے میں مختصر اور سادہ تھے اور انشاؔ کے خیال کے مطابق ان پر باہر کی چھاپ بھی نہ تھی۔ انشاؔ ایک مقام پر فرماتے ہیں[1] "دراصل یہ 'کنھوں' پنجابی ہے۔ اردو کے اکثر فصحاء اس سے پرہیز کرتے ہیں"۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے "انہوں کا بیٹا لاہور کی زبان ہے"[2]

۱؎ ترجمہ دریائے لطافت ص ۳۴۲
۲؎ ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۷۰

اردو میں میر و میرزا کے عہد تک یہ بھی ہوتا تھا کہ ختم ہونے والے افعال و صفات کی حسب قاعدہ ان بڑھا کر جمع بنائی جاتی تھی۔ کڑی کی جمع کڑیاں بھلی کی بھلیاں ہوتی تھی آئی کی آئیاں اور جاتی کی جاتیاں۔ مثلاً

اہا دھیں کی راتیں آئیاں ظالموں نے صبح کر دکھلائیاں

نحو کا قاعدہ تھا موصوف جمع مونث ہے تو اس کی صفت جمع مونث ہو گی

ملائم ہو گئیں دل پہ برہ کی ساعتیں کڑیاں!
یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کا ہار ہو پڑیاں

استمرار کی صورت میں اصل فعل بھی جمع ہوا کرتا تھا جیسے عورتیں آتیاں تھیں اور گاتیاں تھیں۔ مولانا فرماتے ہیں یہ قاعدے زبان میں خوش آہنگی کا باعث تھے۔ اردو نے انہیں ترک کر کے اچھا نہیں کیا۔ اس کا جواب اوپر مذکور ہوا۔ زبان اپنے سرمایے کے اس حصے کو زندہ اور قائم رکھتی ہے جس سے کوئی فائدہ ہو۔ انگریزی، فارسی، بنگلہ وغیرہ بالوں میں مذکر و مونث دونوں کے لئے افعال و صفات یکساں ہوتی ہیں۔ ان زبانوں میں جنس کا فرق و امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ کوئی اسے ان زبانوں کا عیب نہیں سمجھتا اور یہ نہیں کہتا کہ مثلاً مرد نیک و زن نیک یا (GOODWOMAN) اور (GOODMAN) ناقص، "بد آہنگ" یا غیر حکیمانہ انداز بیان ہے۔ صفات و افعال میں جنس کے امتیاز کو ماہرین لسانیات اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور یہ اسے اردو زبان کی قدامت پرستی قرار دے کر کہتے ہیں کہ اس سے زبان کی شائستگی کو ضرر پہنچا جو اس تہذیب و ترقی کے عہد میں زبان کا جوہر ہے۔ مولانا صفت و موصوف اور مسند و مسند الیہ کی مکمل مطابقت برقرار رکھ کر زبان کو گراں بار بنانا اور کئی سو سال پیچھے لے جانا چاہتے ہیں۔ پروفیسر یسپرسن نے مشہور لغوی میڈوگ کا حسب ذیل قول ایک مقام پر نقل کیا ہے[1]

---

[1] زبان میں لمر تقاص سوہم۔

قدیمی تصریفی قاعدے ایک طرح کی لسانی عیاشی ہے ان قواعد کی رو سے ایک خیال جو اصلاً مسند الیہ سے وابستہ ہوتا ہے مسند کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں "وہ گئے" اس میں فعل گیا اس لئے جمع لایا گیا کہ اس میں تعدد تھا اور جانے والے متعدد بار گئے تھے؟"

اس اصول کے مطابق "عورتیں جاتیاں تھیں" میں "جاتیاں" صیغہ جمع مؤنث سے کیا ہم فعل جانا کی کثرت اور اس کی تانیث بتانا چاہتے ہیں۔

لفظوں میں کفایت شعاری موجودہ زندگی کی گوناگوں مصروفیتوں کے پیش نظر کس قدر اہم ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کارنامۂ حیات میں شریک ہیں جب ذیل اردو جملے کی:-

"مرنے والی لڑکیوں کی مائیں روتی روتی کہتی تھیں"

قدیم شکل مولانا یہ بتاتے ہیں:-

"مرنے والیاں لڑکیاں کیاں مائیاں روتیاں روتیاں کہتیاں تھیاں"

ان دونوں جملوں کا مقابلہ کیجئے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ جملۂ اول میں جمع کا صیغہ تین بار استعمال ہوا ہے اور جملۂ ثانی میں آٹھ بار اور لطف یہ ہے کہ تزئین کلام کے سوا اس ناخوشگوار تکرار کا معنوی اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ 'مائیاں' 'مائی' کی جمع ہے۔ ماں کی جمع مائیں ہے۔ 'کی' کی جمع 'کیاں' کبھی دکن میں ہوا کرتی تھی لیکن عام نہ تھی۔ معراج العاشقین میں جہاں صندل کیاں لکڑیاں، رمزکیاں نشانیاں جیسی ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں وہاں پیر کی عنصاں (ص ۲۰) معشوق کی باتاں (ص ۲۲) بھی ملی ہیں۔ جن میں مضاف جمع مؤنث ہے اس کے باوجود حرفِ اضافت کو مفرد لایا گیا ہے۔ شمالی ہند میں حرفِ اضافت کو جمع بنانے کا دستور نہ تھا۔ انشا لکھتے ہیں[1]:-

---

[1] ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۷۲۔

"کی" میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی جو اضافتِ مؤنث کی علامت ہے"

روتیاں۔ کہتیاں کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ یہ اردو ہیں۔ ہر چند میر و سودا کے یہاں مؤنث افعال کی جمع 'اں' کے ساتھ استعمال ہوئی ہے اور اس کی چند مثالیں اوپر درج ہو چکی ہیں لیکن افعال میں جمع کا یہ قاعدہ اردو کے مزاج و منہاج کے خلاف ہے۔ اس کی سادگی پسند فطرت سے بعید نظر آتا ہے کہ اس نے کبھی 'اں' بڑھا کر فعل کی جمع بنائی ہو۔ اردو مؤنث افعال کی جمع 'ں' غنہ بڑھا کر بناتی رہی ہے اور اس کی متعدد مثالیں ہیں:۔

ہوئیں۔ گئیں۔ تھیں۔ آئیں۔ جاتیں۔ وغیرہ

'اں' کا اضافہ اس نے پنجابی سے سیکھا۔ انشاؔ کہتے ہیں[1]:۔

"لگائیں کی جگہ لگائیاں اور تھیں کی جگہ تھیاں مغل پورے والوں کی زبان ہے"

اس کے بعد یہ دیکھ کر کہ اس کے پاس پہلے سے ایک مختصر اور سادہ تمام حقہ 'ں' موجود ہے اس کے ہوتے 'اں' کو اپنانا زبان میں بے ہمی پیدا کرتا ہے اس نے 'اں' کو ترک کر دیا اور بدستور 'ں' غنہ کے اضافے سے افعال کی جمع بناتی رہی۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اردو میں قواعدی ارتقا کا رجحان سادگی اور تخفیف کی طرف ہے۔ جہاں تک ہو سکا اس نے قدیم پیچیدہ صیغوں کو سادہ بنایا، گھٹایا اور کم کیا۔ اردو کے قدیم تر دور میں مفرد اور جمع دونوں میں جنس کا امتیاز تھا۔ آج یہ امتیاز صرف ان کلمات میں ہے جو الف پر ختم ہوتے ہیں۔ جن اسماء کے آخر میں الف نہیں ان کے صیغے مذکر و مونث کے لئے یکساں ہیں۔ جیسے ہے (وہ مرد ہے۔ وہ عورت ہے) ہیں (وہ مرد ہیں۔ وہ عورتیں ہیں) جن کے آخر میں الف ہے ان میں بھی بعض صیغے ایسے ہیں جن میں بصورت تانیث مفرد اور جمع دونوں کے لئے ایک صیغہ استعمال ہوا ہے۔ جیسے۔

---

[1] ترجمہ دریا کے لطافت ص ۲۵ ۔

	(مفرد)	(جمع)
مذکر —	ہے گا	ہیں گے
مؤنث —	ہے گی	ہیں گی (دونوں کیلئے گی[1])

یہی حال "آئی تھیں" "آئی تھیں" وغیرہ کا ہے۔ ان میں مفرد اور جمع دونوں کے لئے 'آئی' اور 'آتی' مفرد افعال استعمال ہوتے ہیں۔ انشا کا بیان ہے کہ دہلی میں مغل پورے والے جن کی زبان اردو کے روزمرہ اور پنجاب کے روزمرہ سے گڈمڈ ہے "ہیں گی" کر "ہیں گیاں" کہتے ہیں[2]۔

اردو کی سادگی پسند طبیعت کی وضاحت ایک اور قاعدے سے بھی ہوتی ہے جو کبھی اردو میں بہت عام تھا۔ آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے حرفِ علت پر ختم ہونے والے افعال کے آخر میں تعمیری لاحقہ اضافہ کرتے وقت ایک ہمزہ (یائے) بڑھا دیا جاتا تھا۔ اور 'جائے' 'فرمائے' 'کرجائے' ہے۔ فرمائے ہے کہتے تھے[3]۔ اور ڈھاکر کو ڈھائے کر۔

دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

اسی طرح 'لائے کر' 'بچائے کر' وغیرہ آج یہ ہمزہ اس وقت بڑھایا جاتا ہے جب لاحقے کے شروع میں کوئی حرفِ علت ہو۔ دوسری صورتوں میں اس کا اضافہ نہیں ہوتا۔ ملاحظہ ہو:۔

ہوئی (ہو + ء + ی) جائے (جا + ء + ے) پیئے (پی + ء + ے)۔

لائے (لا + ء + ے) نہلاؤ (نہلا + ء + و) گھٹائیں (گھٹا + ء + یں)

---

[1] - ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۴۴

[2] - ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۷ و ۱۹۷

[3] - اصل میں پیچے کھتا۔ مادے کی 'ی' بعد میں تخفیف کی نذر ہوئی۔

اب لاحقوں کی کثرتِ استعمال کے تنوع کو لیجئے۔ یسپرسن کے حوالے سے اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ زبان جب ارتقا کی طرف قدم بڑھاتی ہے تو پہلے تعمیری الفاظ پر ہاتھ صاف کرتی ہے جہاں کسی لفظ کی تعمیر میں دو یا دو سے زیادہ الفاظ شریک ہوئے اس نے ان کو چھانٹ دیا جو زیادہ طویل تھے، جن کی ساخت میں الجھاو تھا، یا جو باہر سے زبان میں در آمد کر لئے گئے تھے اور اس کے مزاج کو سازگار نہ تھے، یا جن کی معنویت اور افادیت ختم ہو چکی تھی۔ زبان یہ کام اندھا دھند آنکھ بند کر کے انجام نہیں دیتی۔ ایک فطری اصول اس کے سامنے ہے جس پر وہ عمل کرتی ہے۔ جو لفظ یا لاحقہ لفظی یا معنوی اعتبار سے کارآمد اور زندہ رہنے کے قابل ہوتا ہے، باقی رہ جاتا ہے اور جس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی چھٹ جاتا ہے یا چھانٹ دیا جاتا ہے۔ زبان میں بھی بقائے اصلح کا اصول کارفرما رہا ہے۔

اردو میں مجبوری حالت کے لئے "میر و میرزا کے عہد تک "سے" کے ساتھ اس کی مندرجہ ذیل شکلیں مستعمل تھیں جن کا ذکر انشا نے کیا ہے۔

(۱) سیں (بیائے مجہول) سین (بیائے معروف) ہندو بولتے تھے۔

(۲) سوں۔ ساداتِ بارہہ کی اولاد کی زبان تھی۔

(۳) ستی (س، مکسور، ی، معروف) سیتی (یائے اول مجہول) قدمائے اُردو کی زبان پر تھا۔

دکنی اردو میں "سے" کی مندرجہ بالا اشکال کے ساتھ ذیل کے لاحقے بھی تھے۔

(۱) "تے"۔ معراج العاشقین کا ایک جملہ ہے:۔

اگر اس میں تے یک پردہ اٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔

(۲) "تھے"۔ محمد قلی قطب شاہ کہتا ہے:۔

معانی کی باتاں تھے جھڑتا نمک

ان لاحقوں کے آخر میں "ن" غنہ اضافہ کر کے "تے" کو "تیں" اور "تھے" کو "تھیں" کہا

جاتا تھا۔ اُردو نے ان لواحق کو چھانٹ دیا اور ان میں سے صرف 'نے' کو برقرار رکھا جو ان میں سب سے زیادہ ہلکا پھلکا مختصر سہل التلفظ تھا اور جس پر باہر کی زبان کی چھاپ نہ تھی۔

ظرفی 'میں' کی یہ کیفیت تھی کہ 'منے'، 'موں'، 'ماں'، 'ماٹھ'، 'ماشی' اس کے شریکِ حال بنے ہوئے تھے اور سایہ کی طرح اس کے ساتھ تھے۔ 'اندر' 'بھیتر' اور 'بیچ' کا چلن بھی تھا۔ چمن کے بیچ یا چمن کے بھیتر۔ اُردو نے ان میں سے 'میں' کو منتخب کیا۔

'پر' ہر چند بڑے انقلابات کے بعد 'اوپر' سے ڈھلا تھا لیکن 'اوپر' اس سے چھپا ہوا تھا۔ اہلِ اردو کہا کرتے تھے "میں گھوڑے کے اوپر چڑھتا ہوں"۔ انشا لکھتے ہیں[1]:- "بعض فصحاء اس پر الف اور واو معروف بڑھا کر اوپر بولتے ہیں۔ ان کی گردن پر فصاحت کا خون ثابت ہے"۔

'تک'، 'لوں'، 'تئیں'[2]، 'تونڑی'، 'تاکر' وغیرہ الفاظ 'تک' کی جگہ لیے ہوئے تھے۔ اردو نے ان میں سے 'تک' کا انتخاب کیا۔

ضمائر میں 'وہ' کے مقام پر 'سو' استعمال ہوا کرتا تھا۔ بارھویں صدی کے لگ بھگ 'اس' نے حرفِ جزا کی جگہ لی۔ جیسے جو ہوا سو (وہ) ہوا۔ 'اس' کا ہم معنی 'تس' میرزا کے عہد تک تھا۔

حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا   منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا

سو ابر دیکھیاں ہیں تری بے وفائیاں   تس پر بھی نت غرور ہے دل میں گناہ کا

'تس' چھٹ گیا۔ 'اس' کے ہوتے 'تس' کی کیا ضرورت تھی۔ 'سو' اور 'اس' کا ہم معنی تھ

---

1 ترجمہ دریائے لطافت ص ۳۲۹۔

2 میر درد کا شعر ہے:-

پرورش غم کی ترے یاں تئیں تو کی دیکھا
کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا

آج بھی زندہ اور سلامت ہے۔

'تو' (ضمیر واحد حاضر) کی ایک شکل 'تیں' غالباً 'میں' کو دیکھ کر اور اس کے قیاس پر وضع ہوئی تھی۔ 'تو' فاعلی حالت تھی اور 'تیں' آلی (کبھی 'نے' کے ساتھ اور کبھی 'نے' کے بغیر) میر صاحب فرماتے ہیں:۔

ہوناتھا مجلس آرا گر غیر کا تو مجھ کو   مانندِ شمعِ مجلس کاہے کو تیں جلایا

تیں جلایا۔ تیں نے جلایا۔

فغاں کا شعر ہے:۔

کھا پیچ و تاب مجکو ڈسیں اب وہ کالیاں   ظالم اسی لیے تیں نے زلفیں بھی پالیاں

'تو' نے 'تیں' کو نکال باہر کیا۔ 'تو' اب عام ہے۔ فاعلی اور آلی دونوں حالتوں میں استعمال ہوتا ہے 'وہ' کی جمع 'وے' میر کے یہاں ہے۔

حیف وے جن کنے اُس وقت وہ پہنچا جس وقت

اُن کنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا

سودا نے بھی اسے استعمال کیا ہے:۔

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں   اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

میر و سودا کے بعد بھی 'وے' مستعمل رہا۔ اب متروک ہے اور 'وہ' (مفرد) اس کی جانشینی کر رہا ہے۔ انشاء فرماتے ہیں:[1]۔

"فصحاء کے نزدیک ضمائر کی میزان ۲۵ ہے۔ غیر فصیح ۲۶ بتاتے ہیں کیوں کہ یہ ضمیر منفصل غائب فاعل کے لیے جمع میں 'وے' قرار دیتے ہیں۔"

یسپرسن نے ایک مقام پر انگریزی ضمائر پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے 'کچھ غیر آریائی اور غیر سامی زبانیں ایسی ہیں جو غائب کی ضمیروں میں بھی تذکیر و تانیث کا فرق

---

[1] ترجمہ دریائے لطافت ص ۳۰۵۔

نہیں کرتی اور (HE) اور (SHE) دونوں کے لئے ایک ضمیر استعمال کرتی ہیں، یسپرسن نے اسے ان زبانوں کی شستگی اور شائستگی قرار دیا ہے۔ اس معیار سے دیکھیں تو اردو شائستگی میں ایک قدم آگے ہے کہ وہ غائب کی ضمیر میں جنس کے ساتھ ساتھ عدد کا فرق بھی روا نہیں رکھتی۔ مذکر و مونث واحد و جمع سب کے لئے 'وہ' استعمال کرتی ہے۔ قدیم زمانے میں 'وو' واحد مذکر کی ضمیر تھی اور اس میں خصوصیت اور تعیین پائی جاتی تھی۔ آج عام اور غیر متعین ہے کہ مذکر و مونث واحد و جمع سب کے لئے ہے۔ ممکن ہے کوئی اسے زبان کا عیب سمجھے لیکن اہل علم کہتے ہیں کہ لفظ کی مفہوم کے لحاظ سے عمومیت لفظ کا وہ جوہر ہے جو اس میں اور خیال میں مطابقت یا ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔

مجھے۔ تجھے ہمیں۔ تمہیں تالیفی ضمیریں ہیں اور مجھ کو، تجھ کو، ہم کو، تم کو تحلیلی۔ یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ تحلیلی ضمیروں کی موجودگی میں تالیفی ضمیریں کیسے زندہ رہیں؟ چھٹ کیوں نہ گئیں؟ سادگی، اختصار اور سہولت کا اصول ان میں کیوں نہ برتا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تالیفی ضمیریں (جیسا کہ اردو زبان کے ارتقا میں عرض کر چکا ہوں) اصلاً مفعولی ثانوی ضمیریں ہیں۔ مفعول اول اور ثانی میں بظاہر کوئی فرق نہ تھا اس لئے وہ مفعول اول کے لئے استعمال ہوتی رہیں۔ ان کے اختصار نے ان کو زندہ رکھا۔ اب آہستہ آہستہ یہ تحلیلی ضمیروں کی جگہ لے رہی ہیں۔ اگر ان کے دستبردگی یہی کیفیت رہی تو وہ دن دور نہیں کہ تحلیلی ضمیریں زبان کے عمل سے بے دخل ہو جائیں اور یہ ان کی جگہ لے لیں۔

'کیا چاہیے'، 'پڑھا چاہیے'، 'کرنا چاہیے'، 'پڑھنا چاہیے'، دونوں طرح لوگ بولتے تھے۔ اور شاید لکھتے بھی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ "کیا چاہیے" فصیح تھا اور کرنا چاہیے، بقول انشا اہل کشمیر کی زبان تھی جو دہلی میں آ کر بس گئے تھے۔ انیسویں صدی کے ربع سوم تک "کیا چاہیے" کا عمل رہا۔ میر مہدی مجروح ایک خط میں لکھتے ہیں "ان سے کہا چاہیے کہ ارے بندۂ خدا اخوا سے ڈر" اس کے بعد کہنا چاہیے، فصیح سمجھا جانے لگا۔

عوام کے دربار سے اسے سند ملی۔ آج وہ مستند ہے اور کہا چاہیے 'متروک ہو چکا ہے' اس سے بھی زبان کی انتخابی فطرت روشنی میں آتی ہے۔

صرفی تغیرات کے مقابلے میں زبان کے نحوی قاعدوں میں تغیر کم ہوا لیکن جتنا کچھ ہوا تحریر کی زبان تک محدود رہا۔ ۱۸۰۰ء تک فعل و فاعل میں کوئی خاص ترتیب نہ تھی۔ انشا نے دریائے لطافت میں فعل و فاعل کے استعمال کی جو مثالیں درج کی ہیں ان میں فعل کہیں مقدم ہے اور کہیں موخر۔ جیسے آوے گا تو۔ یا تو آوے گا۔ آوگے تم۔ یا تم آوگے۔ ۱۸۵۰ء کے قریب غالباً فارسی نحو کے زیر اثر فعل کی فاعل پر تقدیم اردو روز مرہ کے خلاف سمجھی گئی۔[1] آج اردو کا مقررہ نحوی قاعدہ یہ ہے کہ فاعل فعل سے پہلے ہو۔ پہلے مضاف مضاف الیہ پر مقدم ہوا کرتا تھا۔ یہ عربی و فارسی کا اثر تھا اور اردو کی اس قدیم پراکرت کے مزاج کے خلاف تھا۔ سر سید کے عہد میں اس کی اصلاح ہوئی اور ماسوا' سوا بجز وغیرہ چند الفاظ کو چھوڑ کر اردو کا قاعدہ یہ ہوا کہ مضاف الیہ مضاف سے پہلے لایا جائے۔

انشا کے زمانے میں حروفِ مغیرہ کا اثر معطوف تک محدود تھا معطوف علیہ پر اس کا اثر نہ ہوتا تھا۔ مثلاً "تین رنڈیاں اور دو ڈومنیوں کا مجرا ہوا" یا "تین رنڈیاں اور دو ڈومنیوں کو زید نے اشرفیاں دیں"۔ انشا یہ مثالیں لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:[2]

بعضوں کے نزدیک موافقت لازمی ہے۔ جیسے تین رنڈیوں اور دو ڈومنیوں کا مجرا ہوا۔ لیکن عدم موافقت فصیح ہے۔"

انشا کے فتوے پر آج کوئی عمل نہیں کرتا۔ آج موافقت فصیح ہی نہیں صحیح بھی ہے، اور عدم موافقت از روئے قواعدِ زبان غلط اور نا صحیح ہے۔

---

[1] گریرسن کا خیال ہے کہ ہندی میں قدیم سے یہ قاعدہ چلا آ رہا ہے کہ فاعل فعل پر مقدم ہو۔ مجھے اس کی صحت میں شبہ ہے کسی دوسرے موقع پر تفصیل سے عرض کروں گا۔

[2] ترجمہ دریائے لطافت ص ۳۲۶

(۸)

مزاج و منہاج

انسان کی طرح زبان بھی ایک مزاج اور طبیعت کا انداز رکھتی ہے جسے میں منہاج کہتا ہوں۔ مزاج زبان کی اندرونی چھاپ ہے۔ صرفی، نحوی، صوتی خصوصیات جن سے زبان کی تعمیر ہوتی ہے زبان کا رجحان اور ظاہری آب و رنگ اس کا منہاج ہے۔ اردو کی علم ادبی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے بیمز، اسمتھ، سکسینہ، وغیرہ اہل علم نے لکھا ہے[1] کہ اردو فصیح و بلیغ، شیریں زبان، واضح بیان، شائستہ اور ترقی پسند زبان ہے۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اردو کی فصاحت و بلاغت، شیریں زبانی و طلاقت لسانی کا راز کیا ہے، وہ کون سی صرفی نحوی خصوصیات ہیں جو اردو کے لیے باعث امتیاز ہیں آخر کس روش خاص پر اردو کو ناز ہے۔

یہ کسی قدر دشوار ہے کہ اردو کے مزاج کو کسی ایک لفظ میں بیان کر دیا جائے۔ انسان کا مزاج پیچیدہ ہونے کے باوجود سادہ تھا کہ یونانی اطباء اسے صرف دو لفظوں میں (حار، یابس۔ رطب، بارد) بیان کر گئے، زبان کا مزاج انسانی مزاج سے

---

[1] جرنل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۶۶ء صفحہ ۱، تاریخ ہندوستان جلد ۲، تاریخ ادب اردو باب ۱۹

شاید کچھ زیادہ پیچیدہ ہے۔ اسے دو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں سہل انگاری سے کام لیں اور منطقی نزاکتوں کو نظر انداز کر دیں تو مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر چٹرجی کی ہمنوائی میں کہہ سکتے ہیں کہ اردو "مردانی زبان یا پرکھ کی بولی ہے"[1]۔ چٹرجی نے مردانی زبان کی وضاحت نہیں کی اور یہ نہیں بتایا کہ مردانی زبان کن صفات کی حامل ہوا کرتی ہے۔ ٹرلش مرشعر مردانہ اسلوب بیان کا ذکر کرتا ہے۔ فرانس کے ادیب یک جنسے (احادی المقطع) قافیوں کو مردانہ اور دو جنسے دوہرے قافیوں کو، جن میں پہلا ضعیف ہو اور دوسرا قوی، زنانہ کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان و ادب کی کچھ خصوصیات انسان کی مردانہ صفات کے مطابق ہیں۔ یسپرسن نے ان صفات کا، جن میں سے کچھ صوتی اور صوری ہیں اور کچھ لغوی اور نحوی، تفصیل سے ذکر کیا ہے[2]۔ آیئے دیکھیں اردو کس حد تک ان صفات کی مالک ہے۔

سب سے پہلے اردو کے صوتی نظام کو لیجئے! حروف صحیح اردو میں واضح، نمایاں اور جلی التلفظ ہیں۔ "ت" "ٹ" ہے اور "د" "ڈ"۔ اہل اردو ان حروف کا تلفظ کچھ ایسے جلی انداز میں کرتے ہیں کہ ان میں کسی قسم کا خلط و اشتباہ نہیں ہوتا۔ ہر حرف دوسرے سے ممتاز اور صاف صاف ادا ہوتا ہے اور گرد و پیش کے کسی حرف یا حرکت کی وجہ سے دبنے نہیں پاتا۔ "ر" عام طور سے حرف صحیح کی صحبت میں دب جاتی ہے لیکن اردو والے "مرد" کا تلفظ کرتے ہیں تو "ر" صاف سنی جاتی ہے۔ "مرت بیائی" (وہ عورت جس کی اولاد زندہ نہ رہے) خاص عورتوں کا لفظ ہے جسے وہ اس طرح ادا کرتی ہیں کہ "ر" ابھری رہتی ہے۔ بھرتا، کرتا، وغیرہ الفاظ کا بھی یہی حال ہے۔

اردو (ک) اور ہائیہ حروف (کھ، گھ، بھ، وغیرہ) کا تلفظ جیسا کہ چٹرجی نے

---

[1] انڈو آرین اور ہندی ص ۱۳۸ -

[2] "انگریزی زبان کا نشوونما اور اس کی ساخت" باب اول "تمہیدی خاکہ"

لکھا ہے[1] صحیح اور درست طریقے سے کرتی ہے۔ بنگلا کی طرح نہ اس کا طرزِ ادا ضعیف ہے اور نہ پنجابی اور گجراتی کی طرح مجہول اور گھٹا گھٹا۔ قدیم زمانے میں شمال، جنوب اور مشرق و مغرب کی زبانیں 'س' کے تلفظ پر قادر نہ تھیں۔ شمال مغرب میں اسے 'ہ' سے بدل لیا گیا اور مشرق میں 'ش' سے لیکن اردو کے علاقے مدھیہ دیش میں 'س' کا صحیح تلفظ ہوا۔ بنگلا آج بھی 'س' کو 'ش' ہی کہتی ہے۔ 'ڑ' اور 'ل' میں اردو امتیاز کرتی ہے جب کہ بہاری بولیوں میں 'ل' 'ڑ' کا قائم مقام ہے جہاں 'گلی' کو 'گاڑی' کہا جاتا ہے اور 'بھیل' کو 'بھیڑ'۔ پنجابی 'ب' کو ٹھیک ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے 'و' سے بدل لیتی ہے۔ بنگلا میں 'ج' 'ز' ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس 'ز' 'ج'۔ جنوبی ہند میں 'ق' کو 'خ' کہتے ہیں۔ اور وہی 'ق' پنجاب میں 'ک' ہو جاتا ہے۔

دنتانی (ت۔ د) اور معکوسی[2] (ٹ۔ ڈ) میں اردو نے امتیاز رکھا۔ آسامی اور بول چال کی گجراتی نے ان میں گڈ مڈ کر کے نئے قسم کے لثوی حروف ALVEOLAR وضع کر لیے۔

حرکات دراصل اردو میں سادہ ہی نہیں ان کی مقدار بھی متعین ہے۔ زیر، زبر، پیش تین حرکتیں ہیں جن کی تین طویل صورتیں ہیں۔ یہ علل (مد) کہلاتی ہیں ('ا' اور 'و' 'ی' معروف) چار مرکب علتیں ہیں۔ زبر اور 'ے' (مجہول) جیسے 'میں' (ضمیر متکلم) زیر اور 'ے' (مجہول) جیسے میں (درمیان) زبر اور 'و' (مجہول) جیسے 'اور' (حرف عطف) پیش اور 'و' (مجہول) جیسے 'اُور' (طرف) بنگلا اور کشمیری کی طرح ان حرکات میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ مرہٹی اور بنگلا میں ان کے علاوہ کچھ اور پیچیدہ حرکتیں بھی ہیں جو حرکتوں

---

[1] "انڈو آرین اور ہندی" ص ۱۲۹۔

[2] انگریزی لفظ REFLEXIVE کا ترجمہ ڈاکٹر زور نے 'کوزی' فرمایا ہے۔ میں معکوسی مناسب سمجھتا ہوں۔ ان حروف کو ادا کرتے وقت زبان کسی قدر پلٹ جاتی ہے۔

کی مقدار کا اردو خاص طور پر خیال رکھتی ہے۔ حرکت کو اسی قدر کھینچتی ہے جتنا کھینچنا چاہیے۔
آسامی، بنگلہ اور پنجابی میں بڑی افراتفری ہے۔ آسامی 'ب'، 'د'، 'ی' اور 'ے'، 'ے' و' میں کوئی فرق نہیں کرتی[1]۔ بنگلا دو حرفی کے فتحے کو اتنا کھینچتی ہے کہ 'الف' ہو جاتا ہے۔ طویل کو قصیر اور قصیر کو طویل کر دینا بنگلا کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ چنانچہ بنگلا میں 'بہار'، 'باھار' اور 'باہر' میں کوئی فرق نہیں۔ پنجابی لفظ کی دوسری علّت (ا، و، ی) کو تلفظ میں دبا دیتی ہے۔ اہلِ پنجاب بے عزتی کو بزتی، تاکید کو تکید، لاہور کو لہور، معلوم کو (جس کا عوامی تلفظ ملوم ہے) ملوم بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہار اور بنگال کے علاقوں میں ابتدائی 'ی' اور 'و' کا تلفظ نہیں ہوتا۔ انشا نے لکھا ہے:-

"وہ فارسی کو اس لہجے سے ادا کرتے ہیں کہ اہلِ ولایت کو ان کی زبان اور لہجے کی صحت سے دھوکا ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کی عربی سے عرب والوں کو دھوکا ہوتا ہے[2]۔"

مراد یہ ہے کہ اہلِ اردو کا لہجہ، تلفظ اور طرزِ ادا اتنا واضح اور صاف ہے کہ اہلِ زبان تک اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔
بنگلا، سندھی، اودھی، برج، آسامی، جدید ہندی وغیرہ زبانوں کے اکثر اسماء و صفات متحرک الآخر ہیں۔ اردو میں یہ متحرک الآخر کلمے حروفِ صحیح پر ختم ہوتے ہیں۔ اس نوع کے کلمات کی اردو میں بڑی ریل پیل ہے جیسے آج، کل، بات، رات، ساتھ، ہاتھ، لچ، مگد، کھانڈ۔ یہ اردو کا مردانہ پن ہے۔ آخر کلمے میں دو حروفِ صحیح کا اجتماع (ایک جنس کے ہوں یا دو جنس کے) اردو پسند نہیں کرتی۔ مرد، شرم، گرم، ترم وغیرہ دو حروفِ صحیح پر ختم ہونے والے الفاظ اردو میں دخیل ہیں جو فارسی سے در آمد ہوئے جب تک یہ الفاظ

---

[1] "آسامی، اس کی تعمیر اور ارتقا" ص ۶۴
[2] ترجمہ دریائے لطافت ص ۳۵۱

اوپر کے طبقے میں رائج رہے ان کا مخلوط تلفظ کسی نہ کسی حد تک برقرار رہا۔ عوام میں پہنچتے ہی انہیں اردو مزاج کے مطابق ڈھال لیا گیا اور ماقبل آخر حرف کو متحرک کر کے مرد کو مرَد، شرم کو شرَم، گرم کو گرَم، نرم کو نرَم، بولا جانے لگا۔ مست، گوشت، پوست قبض آج بھی مخلوط ہیں۔ گوشت اور پوست کو 'و' نے جس کی وجہ سے مخلوط حروف کی کرختگی کسی نہ کسی حد تک کم ہو گئی تھی، برقرار رکھا۔ مست، مستا اور قبض ان پڑھ لوگوں میں قبض (بفتحہ ب) ہوتا جا رہا ہے۔ اردو کے ایسے الفاظ جو دو حروف صحیح پر منتہی ہوتے تمام تر وہ ہیں جن کا ایک جزو 'ن' ہے۔ اور وہ بھی گنے چنے ہیں[۱]۔

ڈنڈ (ورزش یا تاوان) ڈنڑ (ورزش)، جھنڈ، کنڈ، گنڈ، منڈ۔

اک بے نوا کے لڑکے پہ مرتے ہیں شیخ جی   عاشق ہوئے ہیں واہ عجب لنڈ منڈ پر

(انشاء)

ان الفاظ کے باقی رہ جانے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ 'ن' تلفظ میں اتنا ہلکا تھا کہ حرف صحیح کے ساتھ مخلوط ہو کر بھی اس میں کرختگی پیدا نہ ہو سکی۔

پنجابی میں دو حرف صحیح پر ختم ہونے والے الفاظ کی بھرمار ہے۔ ایک حرف صحیح پر کلمے کا اختتام مردانہ پن ہے اور دو حرف صحیح پر اختتام کرختگی۔ اردو میں مردانہ پن ہے کرختگی نہیں۔

اردو کلمات حرف صحیح پر ختم نہ ہوں تو حرف علت پر ختم ہوں گے جیسے کھلا (بنگلا کھال)، کتنا (بنگلا کت) کالا (بنگلا کال) گاڑھا (بنگلا گاڑھ) اردو اسماء وصفات کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) جن کے آخر میں حرف صحیح ساکن ہو۔

(۲) جن کے آخر میں حرف علت (و ا ی) ہو یا معنونہ ن (م) بنگلا، نیندی،

لہ۔ اردو نے اپنے مزاج کے مطابق اس قسم کے تمام الفاظ 'ن' ختم کر کے اور ماقبل حرکت کر کھینچ کر سہل اور خفیف التلفظ بنا لئے ہیں۔ جیسے کھنڈ، سونڈ، لنڈا، چاند۔

سندھی وغیرہ میں، جیسا کہ عرض کیا گیا متحرکات یعنی زبر، زیر اور پیش، پر ختم ہونے والے کلمات بھی ہیں اور ان کی خاصی تعداد ہے۔ اردو میں اس قسم کے کلمات نہ ہونے کی وجہ اس کا مخصوص اندازِ وقف ہے۔ بنگلا وغیرہ زبانوں میں وقف لفظ کے اولین جزو پر ہوتا ہے۔ اردو میں آخری جزو پر۔ آخری جزو پر دباؤ پڑ جانے کے باعث حرف کی آخری حرکت کھنچ جاتی ہے اور جو کلمہ پہلے یک جزا تھا دو جزا ہو جاتا ہے جس کا آخری جزو سخت اور قوی ہوتا ہے۔ یہ سختی بڑی حد تک زبان کی مردانہ قوت اور بھاری بھرکم پن کی دلیل ہے۔

اردو مرکبات و مشتقات کا مقررہ قاعدہ ہے کہ ترکیب کے بعد مرکب کے جزو اول کو کاٹ کر مختصر کر دیا جاتا ہے۔ کاٹ تراش کا عمل عام طور سے حرفِ علت پر جاری ہوتا ہے جیسے پنہارا (پانی ہارا) پسنہاری (پسان ہاری) گھسیارا (گھاس یارا)، ٹیڑھ منوا (ٹیڑھا موا) تھڑ دلا (تھوڑا دلا) اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ کلمے کے آخر میں لاحقہ اضافہ ہوا تو وقف کا زور دوسرے جزو پر جا پڑا اور پہلا جزو کمزور ہو کر ترش گیا۔

اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ یک جزے کلمے قوی التلفظ بھی ہوں لیکن گریرسن کا خیال ہے کہ دو جزے کلمات سے جن کا آخری جزو ضعیف ہو، کسی قدر اعیاں ہو تو یک جزے الفاظ زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اردو یقیناً قوی زبان ہے۔ اس میں یک جزے الفاظ بہت ہیں۔ اردو کے قریب قریب تمام معاون افعال یک جزے ہیں۔ جیسے ہے (جو پہلے "اہے" تھا، تھا (قدیم "اتھا") گا۔ "ہے" سندھی میں آج بھی دو جزا ("اہے") ہے۔ حروفِ ظرفیت، جب، تب (پنجابی جدان، تداں)، اب (بنگلا اکھون) یک جزے ہیں۔ تو، میں، تم، ہم، وہ، ضمیریں یک جزی ہیں۔ ان کے مقابلے میں تسی، اسی، آمی، آمرا، تومرا پنجابی اور بنگلا ضمیریں دو جزی ہیں۔ نے، سے، پر، میں، تک، کا، کو وغیرہ اعرابی لاحقے یک جزے ہیں۔ یہ الفاظ دوسرے الفاظ کے

مقابلے میں زیادہ استعمال ہوتے ہیں اس لئے اُردو زبان کی توانائی اس کی ہمسایہ زبان سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ یسپرسن نے اداۃ تعریف (THE) کے عدم استعمال کو بھی زبان کی توانائی کا ایک عنصر قرار دیا ہے۔ اردو قوی تر زبان ہے کہ اس میں سرے سے آلہ تعریف ہی نہیں۔

اس کا ذکر کر چکا ہوں کہ اردو کو دو حرکات کا اجتماع[1] (HIATUS) سخت ناگوار ہے اس کا تعلق اس مسئلے سے ہے جو اس وقت زیر بحث ہے۔ اجتماعِ حرکات کی صورت میں تلفظ کی توانائی قائم نہیں رہتی اور لفظ دو یا دو سے زیادہ ضعیف التلفظ جزوں میں بٹ جاتا ہے۔ اردو نے ان حرکات کو ملا کر دو جزے لفظ کو یک جزا اور سہ جزے کو دو جزا بنا لیا۔ ذیل کی مثالوں سے اس کی وضاحت ہوگی۔

آ اُر (مشرقی ہندی) دو جزا تھا۔ اُردو نے اس سے اور یک جزا لفظ ڈھالا۔ رکھے آ اُو (پنجابی و ہریانی) اُردو نے رکھا۔ کئی اُن (مشرقی ہندی) کیسا (اُردو) مارے آ (پنجابی) مارا (اُردو)۔ ذیل کے الفاظ میں دو علتوں کا اجتماع اُردو نے گوارا کر لیا کہ لفظ کے دونوں مقاطع (جز) قوی تھے۔

جائی۔ نائی۔ سائی۔ ناؤ۔ کھاؤ۔ جائے۔ لائے۔ کھائے۔ ذیل کے الفاظ کا مقطعِ اول ہر چند ضعیف ہے لیکن ان میں اگر حرکات و علل کا ملاپ ہو جائے تو 'لئے' اور 'لے'۔ 'دیئے' اور 'دے'۔ 'گئی' اور 'گے' کے درمیان کوئی فرق نہ رہے۔

گئے۔ سئے۔ پئے۔ ہوئے۔ ہوئی وغیرہ کلمات (اصلاً طویل المقاطع ہیں) کی ٹے سی ٹے۔ پی ٹے۔ ہو ٹے۔ ہو ٹی) شاید اس لئے برداشت کر لئے گئے۔ بہر حال دو حرکات کی یکجائی اُردو کے مزاج کو سازگار نہیں۔

اس کے علاوہ یسپرسن کا بیان ہے، جسے میں بڑی حد تک صحیح سمجھتا ہوں کہ

---

[1] دو متعاقب مقاطع (جزائے) میں حرکتوں کا اجتماع گرامر کی اصطلاح میں "HIATUS" کہلاتا ہے

بات کو کم سے کم الفاظ میں ادا کرنا مردانہ طرزِ بیان کا خاصہ ہے۔ مرد عام طور سے اختصار پسند کرتے ہیں۔ عورتیں باتونی ہوتی ہیں۔ ہر بات کو گھما پھرا کر کہنا اور بات میں سے بات پیدا کرنا عورت کی فطرت ہے۔ کسی زبان کا اندرونی اختصار اس کے مردانہ پن کی علامت ہے۔ اُردو صرف و نحو کے لحاظ سے مختصر ترین زبان ہے۔ چٹرجی کہتے ہیں اردو گرامر کے اختصار کا یہ عالم ہے کہ گریرسن کی مشہور کتاب "ہندوستان کا لسانی جائزہ" کا ایک صفحہ اس کے لئے کفایت کر گیا جب کہ مصنف کو اودھی، بنگالی، مرہٹی، تامل، تیلگو کے لیے پورے دو صفحے وقف کرنے پڑے۔ مشرقی پنجابی کے قواعد تین صفحات میں سمائے اور میتھلی کے چار صفحات میں۔ یہ مستند اور معیاری اردو کا ذکر تھا روزانہ بول چال کی بازاری اردو کے قاعدے اس سے کہیں زیادہ مختصر ہیں جنہیں چٹرجی کی رائے میں زیادہ سے زیادہ ایک معمولی پوسٹ کارڈ پر لکھا جا سکتا ہے[1]۔

اُردو صرف و نحو آج ان تمام غیر ضروری پیچیدگیوں سے پاک ہے جو کبھی اردو کے قدیم ترین دور میں اس سے چمٹی ہوئی تھیں اور اس کی بعض ہمسر بولیوں میں آج بھی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ میں پیچھے کر چکا ہوں۔ اردو نے وہ تمام اعرابی لاحقے جنہیں تراشا جا سکتا تھا کانٹ چھانٹ کر مختصر کر دیئے "آتی تھیں" کبھی اردو میں "آتیاں تھیں" تھا۔ جو پہلے "آئیں تھیں" ہوا اس کے بعد "آتی تھیں"۔ "گڑھی گھڑیاں" اختصار ہے "کڑیاں گھڑیاں" کا۔ "لوگاں کہتے تھے"۔ میر کے زمانے میں بولا جاتا تھا۔ "یہی ہیں"، "رہی ہیں" غالباً اٹھارہویں صدی کے ربع آخر تک "یہیں ہیں"، "رہیں ہیں" تھا۔ میرزا جان طپش کی ایک غزل "نہیں ہیں" کی ردیف میں ہے۔ اس میں ذیل کے مصرعے اس پرانی اردو کی یاد دلاتے ہیں۔

فرقت میں جن کی ہم نے یہ حالتیں سہیں ہیں

---

[1] انڈو آرین اینڈ ہندی ص ۱۸۱۔

خونناب دل کی پھر تو جوئیں کمی نہیں ہیں

باتیں ابھی تو تم سے کہنی بہت جمیں ہیں

پنجابی کا مندرجہ ذیل جملہ ملاحظہ ہو۔

"اوہ دسے وچ کتیاں ساریاں وڈیاں وڈیاں کوٹھریاں رنگ برنگیاں بعضیاں چاندی دیاں بعضیاں یاقوت دیاں"۔

اس میں جمیعت کا اظہار جدا جدا ہر لفظ سے کیا گیا ہے۔ یہی بات اردو میں کہیں تو تمام لاحقات جمع چھانٹ کر اس طرح کہیں گے "اس میں کتنی ساری بڑی بڑی رنگ برنگی کوٹھریاں ہیں بعض چاندی کی اور بعض یاقوت کی"۔ اس پورے جملے میں صرف ایک اسم 'کوٹھری' جمع ہے۔ باقی اسماء و صفات پنجابی میں جمیعت کے حامل تھے۔ اردو میں مفرد ہیں۔ اس کے باوجود اردو جملے کا مفہوم واضح ہے۔ اس میں وہ 'لڑکھڑاہٹ' نہیں جو اس 'ی' کی لگاتار تکرار سے پنجابی جملے میں پیدا ہو گئی تھی۔

یسپرسن نے زبان میں اختصار سے آگے بڑھ کر حذف و تقدیر کا ذکر بھی کیا ہے اور انگریزی کے ان جملوں کو جن میں خارجی قرائن پر اعتماد کر کے فعل حذف کر دیا گیا تھا بطور مثال پیش کر کے لکھا ہے کہ یہ ایک طرح کا نحوی اختصار ہے۔ اردو وضاحت کی قائل ہے۔ چبا چبا کر باتیں کرنا عورت کی فطرت ہے مرد جلی اور روشن انداز میں بات کرتے ہیں۔ CAN کا ہم معنی اردو میں 'سکنا' ہے۔ انگریزی میں CAN اصل فعل کے بغیر تنہا بھی استعمال ہوتا ہے[1]۔ اور شاید بنگلا 'پاری' (میں سکتا ہوں) کا تنہا استعمال انگریزی محاورے ہی کا اثر ہے معیاری اردو میں فعل کے بغیر 'سکتا' بولنا اردو میں نہیں کر سکا کی بجائے

[1] فارسی محاورہ بھی یہی ہے 'ی توانم' (میں کر سکتا ہوں)

نیں نہیں سکا' کہنا (جیسا کہ بنگال میں عام طور سے بولتے ہیں) درست نہیں۔ یہ نحوی اختصار نہیں کاروباری اختصار ہے۔ اُردو نحوی اختصار برتتی ہے[1]۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی (لاجواب بات کی) میں چاہتا تھا لیکن جا نہ سکا (جانا چاہتا تھا) تو میری کب سنے گا (میری بات) اس کے ڑکا ہوا (اس کے یہاں یا اس کے گھر) داڑھی میں لال بال تھے اس بدخصال کے (بدخصال کے وہاں)۔

اردو کے ارتقا کا زمانہ قریب قریب وہی ہے جو مسلمانوں کی سیاسی پستی اور اخلاقی انحطاط کا ہے۔ اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوتے ہی اردو شاعری کی زبان کھلی اردو اول اول شعر و سخن کی زبان قرار پائی اور ریختہ کہلائی اس کے بعد کہیں انیسویں صدی کے آخر میں سنجیدہ علمی، تاریخی، سیاسی اور تہذیبی مضامین کی ترجمانی کا اسے منصب ملا۔ اردو میں بیک وقت دو صفات پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف وہ جذباتی زبان ہے، دوسری طرف غیر سنجیدہ چھچھورپن کی اس میں جھلک ہے۔ لیکن ان صفات کا تعلق اردو کی ساخت سے زیادہ لفظی سرمایہ اور بیان کے گوناگوں اسالیب سے ہے۔ اردو میں مبالغہ آمیز الفاظ و مرکبات کا شمار نہیں۔ حد کا۔ بے حد۔ بے حساب۔ بے نہایت۔ بدرجہ غایت۔ بے انتہا۔ جب کسی کی مدح یا قدح مقصود ہو تو اردو ان سے کم تر درجے کے الفاظ استعمال نہیں کرتی۔ وہ بلا کا ذہین ہے۔ حد کا کم ظرف۔

وہ حد کم ظرف ہیں جو ایک ساغر میں بہکتے ہیں

(آتش)

اس نے بے حد و حساب دیا۔ اس کی عنایات کا شمار نہیں کیا جا سکتا وغیرہ۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس بیان سے اردو کی متانت کو صدمہ پہنچا۔ لیکن میں عرض کر چکا

---

[1] اختصار کی ایک تیسری قسم بیانی اختصار ہے۔ اسے ایجاز کہتے ہیں یعنی الفاظ کم ہوں اور معنی زیادہ۔ جیسے "مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا" اگر یوں کہتے "مجھ کو پوچھا تو مہربانی کی" تو ایجاز نہ ہوتا۔

ہوں کہ یہ اردو کا قصور نہیں اس کا اندازِ بیان اس کا ذمہ دار ہے جو اس نے اپنے مربیوں میں کی آغوش میں سیکھا۔ اردو ایک آئینہ ہے جس میں اہلِ اردو کے قومی اخلاق کی جھلک نظر آتی ہے۔ جہاں تک زبان کی ساخت اور اس کے مزاج کا تعلق ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو نے لفظ و معنی میں ہم آہنگی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ لفظ میں کسی حرف یا لاحقہ کا اضافہ اردو نے اس وقت کیا جب کوئی نیا مفہوم پیدا کرنا مقصود تھا۔ ہماری بولیوں میں تقریباً ہر لفظ کی تین قسمیں ہیں۔ قصیر (گھوڑی) طویل (گھوڑا) طویل تر (گھوڑوا) معنی اور مفہوم کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں اردو میں [illegible] کے لئے) لاحقاتِ تصغیر ہیں۔ مرد۔ مردوا۔ بجھاڑو۔ بجڑوا۔ بوڑھا۔ بڈھوا۔ لٹ۔ لٹیا موٹا۔ بڑھیا۔ چوہا۔ چوہیا۔ رسالہ۔ رسلیا۔ یہ اردو کی شائستگی ہے کہ اس کا کوئی سابقہ یا لاحقہ بے مصرف نہیں جیسے تزئینِ عام کے لئے بڑھا دیا گیا ہو۔ پیٹ (یعنی پیٹ والا) پیٹو (یعنی بڑے پیٹ والا) دو درجے ہوئے۔ موٹو۔ موٹل۔ موٹلا۔ اس میں تین درجے ہیں۔ جھٹ۔ جھٹکا۔ جھٹکنا یا جھٹکنا۔

زبان منطق کا چربہ ہوتی ہے۔ انسان جس طرح سوچتا ہے اس کی کوشش کرتا ہے کہ ٹھیک اسی طرح اپنے خیالات کا اظہار کر دے تاکہ زبان و بیان (منطق) میں مطابقت رہے۔ یہ مطابقت دو قسم کی ہے۔ ظاہری یعنی قواعدی مطابقت جو دنیا کی زبانوں میں سے صرف چینی کو حاصل ہے۔ زبان پہلے ہے اور اس کے صرفی نحوی قاعدے بعد میں۔ بعض اہلِ علم زبان میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے کبھی کبھی الٹی گنگا بہاتے اور زبان کے قاعدوں کو زبان سے استنباط کرنے کے بجائے خود ساختہ قاعدوں کے مطابق زبان کو توڑتے مروڑتے ہیں[1]۔ زبان کے لئے یہ کوئی اچھی فال نہیں۔ دوسری مطابقت معنوی ہے یعنی زبان کی تعبیرات کی اصولِ فکر سے ہم آہنگی۔ یہ پورے طور پر تو شاید ہی کوئی

---

[1] مثلاً بعض لوگ اس طرح بولتے سنے گئے ہیں "میں نے اسے تین مہینوں سے نہیں دیکھا"، یہ زبان کو قاعدے کے مطابق توڑنا مروڑنا نہیں تو کیا ہے۔

زبان منطق سے ہم آہنگ ہو لیکن یہ سب کہتے ہیں کہ زبان جس قدر انسانی فکر و خیال کی رسم و راہ اور اس کے پیچ و خم سے قریب ہو گی اسی قدر شائستہ اور مہذب سمجھی جائے گی۔ اردو بڑی حد تک اصول منطق کے مطابق ہے۔ اُردو گرو اللف کو اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ گیا۔ وہ گیا ہے۔ وہ گیا تھا۔ منطقی فکر و خیال کے مطابق ہر فعل کا محل استعمال جدا ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

یہاں 'چاہا تھا' کی جگہ 'چاہا' اور 'نہ ہوا' کی جگہ 'نہ ہوا تھا' صحیح نہیں۔ چاہا اور 'ہوا' ہر چند ماضی کے صیغے ہیں لیکن ان کا زمانہ مختلف ہے۔ 'چاہا' پہلے ہے اور 'ہوا' بعد میں۔

اردو میں استمرار کے تین صیغے ہیں جن میں نازک منطقی فرق ہے۔ 'پڑھتا تھا' کا مطلب ہے پڑھنا مدتوں جاری رہا۔ 'پڑھ رہا تھا' سے تسلسل اور استمرار کا اظہار ہوتا ہے۔ 'پڑھا کرتا تھا' یہ اس کی عادت تھی۔ پڑھ لیا، پڑھ دیا، پڑھ چکا وغیرہ مرکب افعال اصول منطق کے مطابق وضع ہوئے جو خیالات کے نازک ترین فرق و امتیاز کو پیش کرتے ہیں۔ امر کے تین صیغے ہیں 'جاؤ' اور 'کہو' کا انداز تحکمانہ ہے۔ 'جانا' اور 'کہنا' میں درخواست ہے 'جائیے' اور 'کہیئے' میں التجا ہے۔ (لگاتار بلا انقطاع) 'پڑھے جاؤ' اس میں استمرار ہے (علی الدوام) 'پڑھتے رہو' اس میں مداومت ہے اور دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

کرنا، دینا، بنانا وغیرہ مصادر کی مدد سے وضع افعال کا طریقہ اردو میں علم ہے۔ چیٹرجی کہتے ہیں اس کا اردو میں اظہار و بیان کی نئی نئی راہیں کھلیں۔ صاف کرنا، بیوقوف بنانا، آواز دینا، کھوج لگانا۔ اردو میں اسم سے فعل بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسم کے آخر میں 'انا' بڑھا دیا جائے جیسے گرمانا، شرمانا، للچانا، سنسنانا، پتھرانا، ٹھنڈیانا۔

ملاحظہ فرمائیے "دریائے لطافت" ص ۹۹-۹۸-

(ٹھنڈا کا الف 'ی' سے بدل گیا تاکہ لاحقہ کے الف سے امتیاز رہے) لیکن یہ عام نہیں صاف سے 'صفیاتہ' اور سیاہ سے 'سیاہنا' نہیں کہتے۔ برقانا (برق سے) فلمانا (فلم سے) نئے الفاظ ہیں۔ کمانا (کم سے) بنگال کی پیداوار ہے۔ خریدنا۔ فرمانا۔ بخشنا۔ لرزنا۔ نوازنا گزرنا وغیرہ فارسی افعال بھی اردو میں مستعمل ہیں۔ قبول سے قبولنا بھی بولا جاتا ہے مول سے مولنا اور خرید سے خریدکرنا ٹکسال باہر ہے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اردو جذباتی زبان ہے وہ جذباتی (EMOTIONAL) بھی ہے اور عقلی (RATIONAL) یعنی منطقی بھی بقول علامہ اقبال

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

زیادہ تر اس نے دل کو پاسبانِ عقل کی نگرانی میں رکھا لیکن کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑا ہے۔ پاسبانی عقل کا تقاضا تھا کہ مرکبات میں اجزا کی ترتیب فطرت کے مطابق ہو۔ جیسے ذیل کے مرکبات میں ہے:۔

چھوٹا بڑا۔ نیا پرانا۔ رہا سہا۔ بندھا ٹکا۔ پڑھا لکھا۔ لیا دیا۔ کھایا پیا۔

لیکن آہنگ کی رعایت سے اردو والے ٹکا بندھا۔ بڑا چھوٹا۔ لکھا پڑھا بھی بولتے ہیں۔ اردو آہنگ کی بڑی رسیا ہے۔ ترکیبِ عطفی کی صورت میں معطوف علیہ (جزو اول) اردو میں چھوٹا ہوتا ہے اور معطوف (جزو ثانی) بڑا تاکہ واؤ عطف جزوِ اول کے ساتھ مل کر اسے طویل بنا دے اور دونوں جزوں میں توازن یعنی آہنگ برقرار رہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شب و روز۔ صبح و مسا۔ باغ و بہار۔ لیل و نہار۔ پیر و جواں۔ ناز و نعم۔ کیف و طرب۔ شور و شغب۔ غیظ و غضب۔ قلب و جگر۔ کم و بیش۔

سجع بھی اردو کا ایک رجحان ہے اردو کے اپنے مرکبات عطفی جن کے درمیان

حروف عطف نہیں ہوتے اس رجحان کے آئینہ دار ہیں۔

اڑوس پڑوس، سان بن۔ آس پاس۔ بن ٹھن۔ تام جھام۔ جل تھل۔ جھل مل۔ چہل بل۔ رم جھم۔ سچ پچ۔ کام دھام۔ لوٹ پوٹ۔ نٹ کھٹ۔ رس بس (اصل میں رچ تھا (مرکب ہے رچ بمعنی جذب ہونا اور بس سے) ’رچ‘ کو بس کے تعلق سے ’رس‘ بنالیا)

اردو کے حکائی الفاظ بھی اسی شمار میں ہیں۔ چھم چھم۔ کھٹ کھٹ۔ جھر جھر بھر بھر، سر سر۔ دھم دھم۔ کھڑ بڑ۔ کھٹ پٹ۔ سٹ پٹ۔

توابع مہمل بھی اسی رجحان کو پیش کرتے ہیں۔ روٹی ووٹی۔ شرم ورم۔ پانی وانی۔ بادل وادل۔

منطق کی طرح اردو کٹر[2] اصول پرست نہیں، سیال اور لچکیلی زبان ہے بعض الفاظ اردو میں جمع استعمال ہوتے ہیں جیسے ’معنی‘ مثلاً اس کے کیا معنی ہیں یا دستخط اس نے دستخط کیے۔ دن، روز، ماہ، مہینہ، سال کی اردو جمع نہیں بناتی۔ میں نے تین ماہ سے اسے نہیں دیکھا۔ تین سال سے وہ غائب ہے، تین دن میں اس کا کیا حال ہو گیا۔

ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

(آتش)

شجر سایہ دار کی کثرت کے باوجود فعل مفرد لایا گیا ہے۔ سودا کا شعر ہے:۔

تم اپنے بیل معنی کو نکالو مرے ہاتھی سے دو ٹکرے لڑالو

یہاں ’دو ٹکریں‘ چاہیئے تھا۔ انشاء اسے صحیح نہیں بتاتے۔ اس کے پاس لکھوکا روپیہ ہے:۔ وغیرہ۔ آپ کے کہنے! کیا خوب (کیسا خوب) ’ہے گا‘ ’میں نے‘ اور ’گا‘ دونوں یکجا ہیں۔

الفاظ کی حد تک اردو بڑی آزاد منش اور ملنسار واقع ہوئی ہے۔ اس نے ہر زبان

[2] ڈاکٹر چٹرجی کہتے ہیں کہ ہندوستانی اپنی فطرت میں آزاد ترین اور معقول ترین زبانوں میں سے ہے (ص ۱۳۸)

سے فیض اٹھایا۔ ہر گوشے سے تمتع حاصل کیا۔ عربی، فارسی، سنسکرت، ترکی، پنجابی، پوربی، برج، پرتگالی، اطالوی، انگریزی تبر زبان کے الفاظ اس نے دل کھول کر قبول کئے جہاں کوئی لفظ نظر پہ چڑھا اس نے آنکھوں سے لگایا اور ادنیٰ تصرف کے بعد اپنایا۔ اردو کی اس فطرت کو دیکھ کر لوگ طعنہ دیتے ہیں کہ وہ مست بھیڑا الخ ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اردو کی ترقی اور کامیابی کا راز اس کی طرار طبیعت میں ہے کہ وہ ہر زبان سے گھل مل جاتی ہے لفظوں کے ترک و اختیار کا معیار خود اردو کی فطرت ہے وہ آزاد کوہساری چشمے کی طرح ہے جو کسی رکاوٹ کے بغیر بہتا اور گنگناتا چلا جاتا ہے کوئی اس کی راہ نہیں بتاتا وہ خود چٹانوں کے درمیان سے اپنا راستہ تراشتا ہے۔ نواب نصیر حسین خیال اردو کی ایک ٹکسال کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ نواب محمد امیر خاں انجام کی نگرانی میں دہلی میں قائم ہوئی تھی جہاں الفاظ و محاورات وضع ہوتے ان پر تصدیق کی مہر لگائی جاتی اور ان کا اجرا ہو جاتا۔ یہ خیال کی خیال آرائی ہے۔ دہلی یا لکھنؤ میں اس قسم کی کوئی ٹکسال نہ تھی اردو کی ٹکسال عوام کی بولی ٹھولی ہے جہاں سے الفاظ کو چلن ملا۔ زبانوں کی خراد پر چڑھ کر یہ الفاظ سڈول بنے تو شعرا اور انشا پردازوں کے دربار تک ان کی رسائی ہوئی۔ اردو کبھی کسی علمی ادارے، جماعت یا انجمن کی سند کی محتاج نہ تھی اس کی فطرت خود سند ہے اس کا مزاج سب سے بڑا تصدیق نامہ ہے۔

ہے مگر تاثیر و شیرینی جو اردو بات میں
علم کے صدقے میں ہے یا فقر کی خیرات میں
پیشواؤں نے جگہ دی اپنی تصنیفات میں
منہ لگایا اگلے درویشوں نے ملفوظات میں
ان غریبوں سے ملی اکثر امیروں کو مدد
اردو کے شاہی کو پہنچائی فقیروں نے رسد (ناطق)

(۹)

"ارتقائی مدارج"

مولانا شیرانی ارشاد فرماتے ہیں[1]:-

"تغلقوں کے عہد میں دہلی میں جس قسم کی زبان بولی جاتی تھی اگر ہم کو اس کے نمونے دیکھنا ہیں تو قدیم دکھنی اردو کے ادبیات دیکھنے چاہئیں جو اس زبان کے بہت قریب ہیں۔ دکھنی زبان میں شعر و شاعری کا آغاز اواخر قرن نہم سے شروع ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اس عہد تک کی بعض تصنیفات ہم کو مل جاتی ہیں۔ ان میں سب سے قدیم میراں جی شمس العشاق کی تصنیفات ہیں۔"

سید محمد حسینی گیسو درازؒ (متوفی ۸۲۵ھ) کا رسالہ معراج العاشقین شائع ہو چکا ہے جو دکنی ادب کی دریافت شدہ کتابوں میں سب سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کے لسانی تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم دکنی زبان دہلی کی موجودہ اردو سے مختلف نہ تھی یا اتنی مختلف نہ تھی جتنا اختلاف دہلی کی اردو اور بعد کی دکھنی اردو میں ہے۔ معراج العاشقین میں

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۷۰

"سی" لاحقۂ استقبال استعمال نہیں ہوا۔ یہ لاحقہ دکنی میں راجستھانی سے آیا۔ مولانا شیرانی فرماتے ہیں۔ "بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ راجپوتانے سے آیا ہو"[1]۔ تجہ، مجہ دکنی اردو میں بطور اضافی ضمائر عام طور سے مستعمل ہیں۔ معراج العاشقین میں ان کی جگہ اردو کی معیاری ضمیریں "میرا"، "تیرا" استعمال ہوئی ہیں۔ دکنی میں ماضی مطلق کے آخری حرف سے پہلے "ی" مخلوط ہوتی ہے۔ جیسے ملیا (ملا) سنیا (سنا) چلیا (چلا) رھیا (رہا)۔ معراج العاشقین میں بھی "ی" موجود ہے لیکن "دیکھا" اور "رکھا" دو صیغے اس میں ی کے بغیر استعمال ہوئے ہیں۔ دکنی میں جمع "اں" کے اضافے سے بنتی ہے۔ معراج العاشقین میں ایک مقام پر کان کی جمع کاناں (اں کے ساتھ) دیکھی گئی ہے۔ دکنی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پنجابی کی طرح جمع مؤنث کی صورت میں علامتِ اضافت کو اس میں جمع بنالیا جاتا ہے جیسے "بہشت کیاں حوراں"۔ لیکن معراج العاشقین میں "پیر کی باتاں" اور "معشوق کی باتاں" جیسی ترکیبیں ملی ہیں جن میں "کی" علامت اضافت مضاف کی جمعیت کے باوجود مفرد ہے۔ دکنی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ اکثر مخلوط ہا حروف کے ہائیہ عنصر کو گرا کر ان کی تخفیف کر لیتی ہے۔ معراج العاشقین میں ذیل کے کلمے اردو کی طرح مخلوط ہا استعمال ہوئے ہیں

سنبھالنا۔ ٹھہرنا۔ بوجھنا۔ دیکھنا۔ اٹھنا۔ چھپنا۔ رکھنا۔ دکھلانا۔ پوچھنا۔ سمجھنا۔ پڑھنا۔ کھانا۔ چھوڑنا۔ کھڑا۔

تغلقوں کے عہد کی دہلوی زبان دکن و گجرات کی اس اردو سے مختلف تھی جس کے نمونے قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے دکنی شعرا کے کلام میں ملتے ہیں اس لئے قدیم دہلوی زبان کا عکس دکھنی ادب کے آئینے میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ دہلی کی اردو سلطان علاء الدین خلجی اور اس کے سپہ سالار ملک کافور کے ہم رکاب

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۱۱۰

۱۳۱۴ء میں دکن پہنچی۔ اس کے بعد محمد تغلق نے ۱۳۲۶ء میں جب اپنا پایۂ تخت دہلی سے دولت آباد منتقل کیا اور دہلی اور اس کے نواح کے باشندے ہجرت کر کے دولت آباد گئے تو اردو بھی ان کے قدموں سے لگے لگے دکن گئی، لیکن دکن کا دہلی سے تعلق منقطع ہوتے ہی دکنی اردو، دہلی کی اردو سے بے نیاز ہو گئی۔ یہ بے نیازی ساڑھے تین سو سال تک قائم رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دکنی اردو متعدد امور میں جو بعض صرف و نحو سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض محاورے سے (دہلوی اردو سے) مختلف[1] ہو گئی" مولانا شیرانی فرماتے ہیں:-

"اردو زبان دہلی میں آنے والے سیاسی واقعات اور ماحول سے برابر متاثر ہوتی رہی۔ اس لئے بدل بدل گئی۔ دکنی تغلقوں کے عہد کی زبان کی جو دہلی میں بولی جاتی تھی تقلید کر رہے ہیں۔"

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کوئی زبان ایک حال پر قائم نہیں رہتی اور اس کا "ماحول اور سیاسی واقعات" کے اثرات سے بے نیاز انہ گزر جانا ناممکن ہے۔ دہلی کی اردو پر ماحول اور سیاسی واقعات کا اثر پڑا لیکن دکن کی اردو اپنے ماحول اور گرد و پیش کے گوناگوں تغیرات سے محفوظ رہی۔ دکنیوں نے تغلقوں کے عہد کی زبان ہی کو بندریا کی کھلڑی کی طرح سینے سے لگائے رکھا۔ کیوں؟ مولانا شیرانی نے اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری نور اس کی یہ وجہ بتاتے ہیں کہ

"شمالی ہندوستانی بولی کھڑی کا ایسا گہرا اثر مرتسم ہوا کہ اس کی بہت سی ابتدائی یا اصلی خصوصیتیں مفقود ہو گئیں اور جو کچھ باقی رہیں وہ مسخ شدہ حالت میں ہیں اس کے برخلاف دکھنی میں قدیم سے قدیم شکلیں اور خصوصیتیں بالکل محفوظ ہیں جن

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۲۷

کی بنا پر وہ جدید پنجابی کے بہت کچھ مشابہ ہے[1]؟

شمالی ہندوستان پر کھڑی کا گہرا اثر مرتسم ہوا اور دکھنی راجستھانی و گجراتی کے اثر سے محفوظ رہی کیوں؟ اس پر پاس پڑوس کی زبانوں کے اثرات کس لئے مرتسم نہیں ہوئے؟ ڈاکٹر زور ہندوستانی لسانیات وادبیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہیں کھڑی بولی کے اثرات کا تجزیہ کر کے دکھانا تھا اور ساتھ ہی بتانا تھا کہ دکھنی اردو گجراتی اور راجستھانی اثرات سے کس لئے محفوظ رہی۔

ڈاکٹر موجوس بلاک کی رائے ہے:۔

"ہندوستانی سپاہی جو اپنی زبان (اردو) کو شمالی ہند اور دکن لے کر گئے پنجاب خاص کے باشندے نہ تھے۔ اس لئے کہ پنجابی اردو سے مختلف اور ممتاز زبان ہے۔ وہ مشرقی پنجاب، انبالے، شمالی دوآبے کے رہنے والے تھے"

ان کے خیال میں:۔

مشرقی پنجاب کے سرحدی اضلاع کی زبان ہندوستانی سپاہیوں کے ہم رکاب دکن پہنچی[2]۔"

میں اس رائے کو حقیقت سے قریب تر سمجھتا ہوں۔ اردو کی قدیم صورت وہ ہے جو بالائی دوآبے میرٹھ، سہارنپور، مظفر نگر اور انبالے کی موجودہ بول چال کی اردو سے قریب ہے، یہ زبان مسلمان سپاہیوں کے ساتھ ملک کے ہر حصے میں پہنچی۔ شمال و جنوب کے ہر ضلع تک اس کی رسائی ہوئی۔ یہ جہاں گئی وہاں کی زبان سے گھل مل گئی۔ اس نے ملک کی ہر زبان سے فیض اٹھایا۔ ہر گوشے سے تمتع حاصل کیا دہلی، میرٹھ اور اس کے نواح سے شمالی ہند کی زبان کا تعلق قائم رہا اس لئے وہ اپنی اصل سے نہ بچھڑ سکی۔ اس کی وحدت

---

[1] ہندوستانی لسانیات صفحہ ۹۶

[2] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۵ صفحہ ۳۴۰

برقرار رہی۔ جنوبی ہند میں بہمنی بادشاہوں کی خود مختاری کے بعد ہی اس کا تعلق شمالی ہند کی زبان سے منقطع ہو گیا۔ ساڑھے تین سو سال تک دکھنی اردو اپنی ماں شمال کی اردو سے نہ مل سکی۔ پاس پڑوس کی اجنبی زبانوں دراوڑی، گجراتی، راجستھانی سے گھلی ملی رہی اور رشتے قائم کرتی رہی۔ ساڑھے تین سو سال کی طویل جدائی اور اجنبی زبانوں سے خلا ملا شمالی ہند کی اردو اور دکنی اردو کے درمیان اختلافات کا ذمہ دار ہے یہ اختلافات کچھ صوتی قسم کے ہیں جو یہ ہیں۔

(۱) دکنی میں ایک حرکت پیش اور واؤ کے درمیان ہے۔ یہ دراوڑی سے لی گئی ہے۔ اور اکثر انہی الفاظ میں پائی جاتی ہے جو ان زبانوں سے اردو میں آئے۔ جیسے ٹپا (چھوکرا) دبا (موٹا)، ڈپا (ٹوپی)

(۲) دکنی طویل حرکت کو کوتاہ کر لیتی ہے۔ جیسے:۔

ادمی (آدمی) اسمان (آسمان) بھگنا (بھیگنا) سنگھنا (سونگھنا)

(۳) دکنی کا میلان مشدد حروف کی طرف ہے جیسے:۔

چنّا (چونا)، پھکّا (پھیکا)، ہتّی (ہاتھی)

(۴) دکنی مخلوط ہا حروف کے ہائیہ عنصر کو گرا کر حرف کی تخفیف کر لیتی ہے جیسے سمدی (سمدھی)، باندنا (باندھنا) کدر (کدھر) گڑا (گڑھا) سیڑی (سیڑھی)، بڑائی (بڑھائی) منج (مجھ)، تج (تجھ) کچ (کچھ)۔

صرفی نحوی اختلافات میں سے مندرجہ ذیل اہم ہیں:۔

(۱) دکنی 'اں' کے اضافے سے جمع بناتی ہے جیسے گھراں۔ ادمیاں۔ پیالاں۔

(۲) دکنی ماضی مطلق (فعل متعدی) کو بطور معروف استعمال کرتی ہے اور اردو بطور مجہول۔ دکنی میں فعل فاعل کے مطابق ہوتا ہے۔ اردو میں مفعول کے مطابق۔

نوٹ:۔ یہ تفصیلات اور مثالیں زیادہ تر ڈاکٹر زور کی کتاب 'ہندوستانی لسانیات' سے ماخوذ ہیں۔

لڑکا روٹی کھایا۔ لڑکے روٹی کھائے۔ لڑکی لڈو کھائی۔ لڑکی لڈواں کھائی۔

(۳) دکنی مصادر کے آخر میں ن مغنہ ہوتا ہے۔ جیسے مارناں۔ کھاناں وغیرہ

(۴) ماضی مطلق کے ماقبل آخر دکنی میں ی محفوظ ہوتی ہے۔ سنیا۔ پڑھیا۔

(۵) دکنی گا کے ساتھ ساتھ سی لگا کر بھی فعل مستقبل بناتی ہے۔

(۶) دکنی میں سو، ہے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے ممکن کی انکھ سوں غیر نہ دیکھنا سو (ممکن کی آنکھ سے غیر کو نہ دیکھنا ہے)

(۷) اچھ ہو کے معنی میں دکن میں مستعمل ہے۔

(۸) ہمن۔ تمن، اور ہما، تما وغیرہ ضمائر کی شکلیں اردو کی معیاری ضمیروں سے مختلف ہیں۔

ان میں سے حرکات کی تقصیر، حروف صحیح کی تشدید، اور حائیہ حروف کی تخفیف کو لسانی حیثیت سے میں اہم نہیں سمجھتا۔ دکنی اردو کی یہ خصوصیات زیادہ تر منظوم کلام سے ماخوذ ہیں۔ ہو سکتا ہے نظم کی کڑی پابندیاں ان تصرفات کی ذمہ دار ہوں دکن کے شعرائے، جن کے سامنے اردو نظم کا کوئی نمونہ نہ تھا ضرورت شعری سے مجبور ہو کر اکثر اس نوع کے تصرفات کیئے۔ اور مذکر کو مونث، مونث کو مذکر، مخفف کو مشدد، مشدد کو مخفف، متحرک کو ساکن، ساکن کو متحرک باندھا اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کلمے اس زمانے میں بول چال کی زبان میں اسی طرح رائج تھے۔ اس کے علاوہ دکنی میں تشدید ہی نہیں تخفیف و تسہیل بھی دیکھی گئی ہے۔ دکنی شعرائے ہات (ہتھ) آگ (اگ) آج (اج) کال (کل) اتنا، اِیتی (اتا۔ اتی) چونا (چننا) راکھے (رکھے) تائیں (تئیں) ھاڈ (ہڈی) جاگا (جگہ) لوہو (لہو) وغیرہ کلمات عام طور سے استعمال کئے ہیں۔

نوسرس میں ذیل کے کلمے مسہل ہیں۔

پھاندا (پھندا) پوتلی (پتلی) کیرن (کرن) آنجھو (انجھو) دیسنا (دسنا) چاتر (چتر)

موں (منھ)۔

صرفی نحوی اختلافات میں سے 'ان' لاحقۂ جمع، جو دکنی کی نمایاں ترین خصوصیت ہے راجستھانی سے لیا گیا ہے۔ اس پر پنجابی اثر بھی ہو سکتا ہے۔ اضلاعِ پانی پت، سہارنپور اور مظفر نگر میں بھی جیسا کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا ہے، جمع کا یہ قاعدہ رائج ہے[1]۔ البتہ ماضی مطلق کا استعمال بطور معروف ڈاکٹر گریرسن کی رائے میں تمام تر اوڑی زبانوں کا شرمندۂ احسان ہے۔

"مدراس اور بمبئی کے جنوبی حصے میں گرد و پیش کی دراوڑی زبانوں کے زیر اثر ماضی مطلق کا مجہولی استعمال ترک کر دیا گیا۔ متعدی اور غیر متعدی افعال اب ایک انداز سے استعمال ہوتے ہیں۔ ہر چند فاعل پر جو ترکیب میں نائب فاعل ہوتا ہے۔ 'نے' بھی آتا ہے، لیکن 'نے' کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور فعل عدد و جنس میں فاعل کے مطابق ہوتا ہے۔ بمبئی کے وسطی علاقے میں مرہٹی کی موجودگی نے فعل متعدی کے مجہولی استعمال کو ہنوز برقرار رکھا ہے[2]"

مصادر کے 'ن' (مضمونہ) کی بابت گریرسن لکھتے ہیں کہ وہ قدیم ہے اور سنسکرت' علامتِ بے جنس 'م' (کرنم = کرناں) کی یاد دلاتا ہے۔ یہ 'ن' ہریانی اردو میں بھی تھا۔ اس لئے ہو سکتا ہے بانگرو علاقے کے سپاہی اسے اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔

ماضی مطلق کی 'سی' پر پہلے بحث کر کے بتا چکا ہوں کہ وہ قدیم اپ بھرنش کی یادگار ہے۔ ہر چند دہلی کی قدیم زبان میں ماضی کی 'سی' نہیں ملی لیکن یہ چونکہ مخلوط التلفظ ہے۔ اس لئے اس کا امکان ہے کہ اردو کی سادگی اور سہل انگاری یا نازک طبعی کی وجہ سے تخریب صوتی کی نذر ہو گئی ہو۔ میں اسے پنجاب کا اثر نہیں سمجھتا۔

---

[1] کلیات ولی صفحہ ۳۹

[2] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۵۸

مستقبل کا 'سی' اور مصدر کا 'سو' بجد کی پیداوار ہیں اور غالباً راجستھانی سے دکنی میں درآمد ہوئے۔ ان میں سے سی، 'سس' کی شکل میں پراکرت میں بھی تھا۔ اور جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، اس کی موجودہ تخفیفی شکل اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ پنجابی نہیں۔ اگر پنجابی ہوتا تو مخفف نہ ہوتا۔ 'سو' 'ھو' کا قدیم روپ ہے اور 'اس' (ہونا) سے لیا گیا ہے۔ یہ ہریانی اور دکنی میں راجستھانی سے آیا۔ ہمن، ہمتن اور اچھ (سنسکرت اس بمعنی ہونا) پر بھی راجستھان کی چھاپ ہے۔ 'اس'۔ 'اہ' 'یا' ہے' کی بجائے گجراتی اور مارواڑی زبانیں 'اچھ' اور چھے استعمال کرتی ہیں۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو میں شعر و شاعری کا آغاز دکن سے ہوا یا یوں کہیے کہ باقاعدہ اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی شمالی ہند میں زیادہ تر فارسی، برج یا اودھی کا چرچا تھا۔ مسلمان فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے اور ہندو برج یا اودھی میں۔ اگرچہ کبھی کبھی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے مسلمان برج اور اودھی سے اور ہندو فارسی سے شغل کر لیا کرتے تھے۔ اکبر کے حسب ذیل دو شعر ڈاکٹر چیٹرجی نے نقل کئے ہیں۔ یہ دونوں برج میں ہیں:۔

جاکو جس ہے جگت میں جگت سراہے جاہی تاکو جنم سپھل ہے کہتا اکبر ساہی

(جس کی دنیا میں شہرت ہے اور جسے دنیا سراہتی ہے اکبر بادشاہ کہتا ہے۔ اُسی کی زندگی کامیاب ہے)

دوسرا شعر ہے:۔

پیتھل سوں مجلس گئی تان سین سوں راگ ہاسبو، رمبو، لوبو گیو بیربل ساتھ

(پرتھی راج کے اُٹھ جانے سے مجلس کی رونق گئی اور تان سین کے اٹھ جانے سے راگ رنگ۔ لیکن بیربل اپنے ساتھ ہمارا ہنسنا، کھیلنا اور لبھانا لے گیا)

اورنگ زیب دکن میں تھا۔ بنگال کا ایک مسلمان طویل سفر کر کے اس کا مرید ہونے

آیا تو اورنگ زیب نے اُسے یہ شعر پڑھ کر سنایا:-

ٹوپی لیندے بال دی دیندے کھرے نلج
چوہا کھاندا ماودی توکل باندھے چھج

(ٹوپی لیتے ہیں بڑے بال دیتے ہیں ترے بے شرم! چوہا گھر کھودے ڈالتا ہے اور توکل پہ چھجا درست کرے گا۔)

یہ شعر پنجابی میں ہے۔

شمالی ہندوستان میں اٹھارہویں صدی سے پہلے قدیم اردو یعنی کھڑی میں جو کچھ کہا گیا وہ دل بہلانے کے لئے تھا۔ لسانی اعتبار سے اس کی اہمیت مسلم ہی۔ ادب میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ دہلی میں اردو شاعری صحیح معنی میں دکنی کے اثر سے شروع ہوئی جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے جسے ڈاکٹر زور نے تذکرۂ بے جگر کے ایک مخطوطے نقل کیا ہے[1] ثابت ہوتا ہے:-

"چوں در سن اثنا جلوس محمد شاہی دیوان او (ولی) بدہلی رسید موزوں طبعان بلند فکر، دعالی تلاشان ہم عصر، مثل حاتم و آبرو و فغاں بہ تتبع زبانش پیرو و ہم زبان شدند"۔

دہلی کے دور اول کے شعرا نے صرف اسلوب ہی میں ولی کی تقلید نہیں کی۔ بلکہ زبان بھی انہوں نے وہی رکھی جو ولی اور دکن کے دوسرے شعرا کے یہاں استعمال ہوئی تھی تقلید اور تتبع کا سلسلہ متقدمین شعرا کے دور دوم تک چلا۔ میر و میرزا سے پہلے اگرچہ دکنی زبان کے خلاف دہلی میں ردعمل شروع ہو گیا تھا اور اصلاح زبان کی تحریک کی بنیاد حاتم و مظہر کے ہاتھوں پڑ چکی تھی، لیکن دکنی الفاظ اور محاورے ناسخ کے زمانے تک چوری چھپے اردو شعرا کے کلام میں راہ پاتے رہے قائم چاندپوری کہتے ہیں:-

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

---

[1] ہندوستانی لسانیات صفحہ ۱۱

اس سے مولانا شیرانی کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ میر و مرزا کے زمانے کی اردو دکنی اردو یعنی پنجابی سے مختلف نہ تھی۔ بعد میں شعرا نے تصرفات کر کے اردو میں بر ہمی پیدا کر دی ؎

"ان زبانوں میں جو اختلاف دیکھا جاتا ہے وہ اکثر اس وقت واقع ہوا ہے جب اردو کی پرداخت شعرا اور تعلیم یافتہ طبقے نے دہلی اور لکھنؤ میں شروع کی ہے۔ انہوں نے اپنی دانست میں اردو کی اصلاح کی مگر اکثر مو قعوں پر دیکھا جاتا ہے۔ کہ ان کی اصلاح و ترمیم کے اصول نے ایک صرفی کے نقطۂ نظر سے زبان کے قواعد میں ابتری و برہمی پیدا کر دی ہے[1]"

۱۷۰۰ء کے شروع میں جب دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا تو دہلی کی زبان دکنی اردو سے مختلف تھی۔ یہ اختلاف شعرا کی اصلاحات اور تعلیم یافتہ طبقے کے تصرفات یا جدتوں کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ان اسباب کی وجہ سے جن کا ذکر میں نے اوپر کی سطروں میں کیا۔ دکن و گجرات کی اردو گجراتی، راجستھانی، دراوڑی اثرات قبول کر کے دہلی کی اردو سے دور جا پڑی تھی۔ اور اپنی اصل سے بچھڑ گئی تھی۔ اگر دہلی کی اردو دکن کی زبان سے اس وقت مختلف نہ ہوتی تو شیخ سعد اللہ گلشن ولی کو ہرگز یہ مشورہ نہ دیتے۔

"شما دکنی را گوشۂ ریختہ را موافق اردوے معلی شاہجہاں آباد موزوں بکنید"

اور شاہ حاتم یہ نہ فرماتے :۔

"فقط روزمرۂ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیح گویانِ رند در محاورہ دارند منظور داشتہ"

دہلی کی زبان میں الفاظ و محاورات کا داخلہ دکنی شعرا کے اثر سے ہوا۔

ڈاکٹر گریرسن لکھتے ہیں[2]

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۱۰۳

[2] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ صفحہ ۵۸

• اردو شاعری کی دکن نے ابتدا کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اردو نظم میں جو شمالی ہند میں لکھی گئی دکن کے مخصوص محاورات راہ پا گئے اردو نثر ان محاورات سے خالی ہے۔"

قائم چاندپوری کے ذیل کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے سے لے کر بہادر شاہ اوّل کے عہد تک دکن میں جو زبان بولی یا لکھی جا رہی تھی وہ دہلی کی رائج الوقت زبان سے مختلف تھی۔

"از عہد عبداللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمان بہادر شاہ اول کسانے کہ شعر ریختہ گفتہ اند . . . . ہر چند اکثر الفاظ غیر مانوس گوش ما مردم مستعمل ایشاں است لیکن چونکہ موافق زبان دکن راست و درست است پیش ہمہ کس راہ بدو دارد[1]"

مولانا شیرانی دہلی کے اردو شعرا کے اصول اصلاحات کا ذکر کر کے فرماتے ہیں۔

"ایک صرفی کے نقطۂ نظر سے انہوں نے زبان کے قواعد میں ابتری و برہمی پیدا کر دی ہے"

ان اصلاحات کا تعلق ان الفاظ، محاورات اور صیغوں سے ہے جن کا دہلی میں رواج نہ تھا اور جو دکن کی اردو شاعری کے اثر سے دہلی کی زبان میں رواج پا گئے تھے۔ قائم کے لفظوں میں وہ دہلی والوں کے لئے اجنبی اور نامانوس تھے۔ دہلی کے شعرا نے انہیں اس لئے اپنے لسانی سرمایہ سے نہیں نکالا کہ اردو کی اصلاح ان کے پیش نظر تھی یا استبدادی طور پر وہ زبان میں تراش خراش کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ الفاظ اور محاورے اردو زبان کے نہ تھے۔ ولی اور اس کے ہم عصر شعرا دکن کے اثر سے ریختہ میں راہ پا گئے تھے اور دہلوی اردو کا جزو نہ بن سکے تھے۔ صرف نظم میں مستعمل تھے۔ نثر میں ان کا رواج نہ تھا۔ اردو میں ان کا چوروں کی طرح داخلہ زبان میں برہمی و ابتری پیدا کر رہا تھا۔ اس لئے ریختہ کے باغ کو اس خس و خاشاک سے صاف کرنا ضروری تھا۔

---

[1] مخزن نکات صفحہ ۱۳

ڈاکٹر چیٹرجی کا خیال ہے کہ مسلمان سپاہیوں کے ہمراہ دکن و گجرات جانے والی کوئی ایک زبان نہ تھی۔ ایک دوسرے سے ملتی جلتی کئی بولیاں ساتھ ساتھ دکن گئیں، جو گول کنڈہ میں مل جل کر ایک ہو گئیں۔ اُردو بولنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے اس میل جول میں اردو غالب رہی لیکن پنجابی، برج، ہریانی عناصر گھل مل کر اردو کا گوشت پوست بن چکے تھے اس لئے جب تک اورنگ زیب نے دکنی ریاستوں پر حملہ کر کے انہیں ممالک محروسہ میں شامل نہ کر لیا یہ اجنبی عناصر دکنی اردو سے جدا نہ کئے جا سکے۔ یوں تو ہجرت کر کے دکن جانے والے پنجاب کے گوجر، ہریانہ کے جاٹ اور ہندوستانی علاقے کے بے شمار لوگ تھے لیکن دکنی اردو کا نام اول اول گجری تجویز ہوا جسے دکن کے شعراء اور مصنفین نے بھی پسند کیا۔ ڈاکٹر زور فرماتے ہیں ؎:-

"ان گجراتیوں کا اس قدر اثر ہو گیا تھا کہ بعض دکنی مصنف بھی اپنی گجراتی آمیز ہندوستانی کو گجری کے نام سے موسوم کرنے لگے"

میراں جی شمس العشاق کے صاحبزادے شاہ برہان الدین جانم (متوفی ۱۵۸۲ء) کتاب حجتہ البقاء میں فرماتے ہیں:-

جے ہو دیں گیان بچاری نہ دیکھیں بھاکا گوجری

محمد امین کی مثنوی "یوسف زلیخا" عالمگیر کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ یہ دکنی زبان میں ہے لیکن امین اسے گجری کے نام سے یاد کرتے ہیں:-

سنو مطلب اَہے اب یو امین کا لکھی گجری منے یوسف زلیخا
ہر اک جاگا ہے قصہ فارسی میں امیں اس کو اتاری گوجری میں
کہ بوجھے ہر کدام اس کی حقیقت بڑی ہے گوجری جگ بیچ نعمت

؎ ہندوستانی لسانیات صفحہ ۱۰۴ -

ڈاکٹر چٹرجی کہتے ہیں[1]۔ دکنی کا نام گجری اس کی اصلیت اور مشابہت کا آئینہ دار ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے گوجر جنہوں نے پنجاب کے دو شہروں کو گجرات اور گوجرانوالہ کا نام دیا۔ شمالی ہند کی فوجوں کے ساتھ ہجرت کر کے دکن گئے تو انہوں نے اپنے نام اور بولی کو کچھ دن کے لئے زندہ اور قائم رکھا۔"

اس سلسلے میں یہ امر غور کے قابل ہے کہ مولانا شیرانی کے خیال میں غیاث الدین تغلق نے جس کی زندگی کا بڑا حصہ پنجاب میں گذرا پنجاب کی زبان کو دہلی پہنچایا۔ غیاث الدین ۷۲۰ھ میں پنجابیوں کے بڑے لشکر کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا۔ ۷۲۸ھ میں غیاث الدین کا فرزند محمد تغلق پنجابیوں کے لاؤ لشکر کو لے کر دکن روانہ ہو گیا۔ اس کے لشکر نے صرف آٹھ سال دہلی میں قیام کیا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ غیاث الدین کا فرزند محمد تغلق دہلی کی زبان کو دکن لے گیا۔ تو یقین کیجئے کہ وہ دہلی کی زبان نہ تھی جو دکن گئی اس لئے کہ دیپال پور کے سپاہی پنجابی بولتے ہوئے دہلی گئے تھے جو آٹھ سال دہلی میں قیام کرنے کے بعد دکن روانہ ہو گئے۔ آٹھ سال کے اندر نہ وہ دہلی کی زبان سیکھ سکتے تھے کہ اس کو اپنے ہمراہ لے کر دکن جاتے اور نہ دہلی کی اردو کو اپنے قیام کے زمانے میں پنجابی سے متاثر کر سکتے تھے۔ یہ مولانا کا محض قیاس ہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ واقعات اور حالات اس کی تائید نہیں کرتے۔

بہر حال دکنی اردو میں پنجابی اثرات دکن کی پیداوار ہیں۔ دہلی کی قدیم زبان پنجابی اثرات سے پاک تھی۔ یہ اثرات دکن کی زبان میں پنجاب سے آئے یا جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا۔ گجرات اور راجستھان کی بولیوں سے۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق دوسرے خیال کے موید ہیں۔

"وفات نامہ حضرت فاطمہ مصنفہ حضرت اسماعیل امروہوی کے تبصرے

---

[1] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۸۶-۱۸۵۔

میں میں نے چند مثالیں پیش کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ کہ دکھنی اور گجری یا گجراتی دراصل وہی زبان ہے جو دلی سے ان علاقوں میں پہنچی البتہ اس میں مقامی الفاظ اور ترکیبیں بھی شامل ہو گئیں [1]۔

مولانا شیرانی کو بھی اس کا احساس تھا کہ جو الفاظ اور مصادر آج کی پنجابی اور قدیم دکنی میں مشترک ہیں وہ برج، گجراتی اور اودھی میں بھی ہیں اسلئے ہو سکتا ہے کہ دکنی اردو نے انہیں برج یا گجراتی سے لیا ہو لیکن وہ اپنے اس احساس کو یہ کہ کر دباتے رہے۔

"سب بحیثیت مجموعی (برج، گجراتی یا اودھی میں) نہیں ملتے اس لئے ہم اس قیاس میں حق بجانب نہیں ہیں۔ کہ اردو نے ان مصادر کو برج یا دیگر زبانوں سے لیا ہے" [2]

یہ مصادر بحیثیت مجموعی برج یا گجراتی میں نہیں ملتے" اس لئے جو ملتے ہیں وہ بھی برج یا گجراتی سے ماخوذ نہیں۔ کیوں؟ کیا یہ ضروری ہے کہ سب مصادر ایک زبان سے ماخوذ ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کچھ برج سے لئے گئے ہوں اور کچھ گجراتی اور پنجابی سے نسنا ایک مصدر ہے جو پنجابی میں بھاگنے کے معنی دیتا ہے۔ سنسکرت میں یہ نش (فنا ہونا بھاگ جانا) تھا۔ اس سے نشٹ (خراب و برباد) حالیہ تمام وضع ہوا۔ جو ہندی اور بنگلہ میں آج بھی ہے۔ پراکرت نے 'نش' کے 'ش' کو 'س' سے بدل کر 'نس' بنایا اور 'نشٹ' سے ایک نیا کلمہ 'نٹھ' گھڑا۔ نسنا۔ نٹھنا ہم معنی الفاظ ہیں۔ اول الذکر مادہ فعل سے وضع ہوا اور ثانی الذکر حالیہ تمام سے۔ لہندا اور سندھی نے 'س' کو 'ہ' سے بدلا تو 'نہ' وجود میں آیا۔ قدیم پنجابی میں 'نہا' مستعمل تھا۔ سندھیوں کا یہ جملہ تاریخ فیروز شاہی سے اوپر نقل ہو چکا ہے۔ "برکت شیخ نٹھیا۔ ایک موا ایک نہا" 'اہیں نہا' 'نسا' کی بدلی ہوئی صورت ہے پنجابی کے بیرونی مزاج کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ 'نسا' پنجابی نہیں گجراتی ہے پنجابی اور

---

[1] اردو جنوری ۵۲ء ص ۱۲

[2] پنجاب میں اردو، ص ۱۲۹

قدیم دکنی والوں نے اسے گجرات سے درآمد کیا۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی (متوفی ۱۰۳۷ھ) کی کتاب 'نورس' کے مطالعے سے دکنی پر برج کے اثرات کا سراغ ملتا ہے اس کتاب میں مصنف نے جو دوہے بطور مثال درج کئے ہیں ان میں بہت سے برج آمیز دکنی زبان میں ہیں۔ مثلاً ذیل کے دوہے میں:۔

حوریاں پریاں چھپیاں کم و اکاس کو پتال

(حوریں اور پریاں چھپ گئیں۔ کوئی آسمان میں جا چھپی اور کوئی زیرِ زمیں)

'کو' برج ہے۔

ایک شعر ہے:۔

حضرت محمد جگت گرگسائیں   تو درگہ چمک میرو من سار

(حضرت محمد جگت گرو یعنی معلمِ عالم ہیں۔ تیری درگاہ مقناطیس ہے اور میرا من لوہا)

اس میں تو درگہ (تیری درگاہ) دکنی اور میرو من (میرا من) برج شیر و شکر ہو گئے ہیں۔

ذیل کے مصرعے میں:۔

من چاہے سو نس بھئی ہم تم رہیں اب سکھی

(دل جس شب کا خواہاں تھا وہ آگئی، ہم تم اب خوش کیوں نہ ہوں)

نس بھئی (رات ہوئی) خالص برج ہے)

یو لچھن اکھیں ابراہیم کو ناکار

(کوئی ابراہیم یہ صفت بتاتے ہیں)

اس میں لچھن، اور اکھیں، برج سے لئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ذیل کے الفاظ کتاب نورس میں برج کے لہجے کے مطابق استعمال ہوئے ہیں۔

وا (اس)، ما (اس)، مو (مجھ)، جے (جو) لوں (تک)

ذیل کا شعر برج میں ہے:-

نیم نس مو پر ہی لاگت سوم آوت مو مناون

مو پر ہی اگن جل دیکھت آوت ہو یم کرن

(نصف شب مجھ پر ہن کو منانے چاند آتا ہے اور آتش فراق سے جلتا دیکھ کر مجھے ٹھنڈا کرتا ہے[1])

دکن اور گجرات کی اردو میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ چند مقامی الفاظ اور محاورات ہیں جو گجراتی اردو میں ہیں دکنی میں نہیں، یا دکنی میں ہیں گجراتی اردو ان سے خالی ہے مثلاً میں (حرف جر) کے معنی میں دکنی عام طور سے 'منے' استعمال کرتی ہے اور گجراتی 'مانہ' مانہی اور مہیں۔ خوب محمد چشتی کہتے ہیں۔

جتناں طالب کوں بس ہوئے　　　میں اس مانہہ کہیاہوں سوے

'سوے' بمعنی 'سب' بھی گجراتی ہے۔

گجراتی عام طور سے لفظ کی حرکت کو کھینچ کر طویل بنا لیتی ہے جیسے۔

کوتا (کتا) کال (کل) گھٹنا ٹنا (گھٹنا) پھیر (پھر) کھیلا (کھلا) ایتا (اتا) ایتی (اتی)

ڈاکٹر ظہور آخری حرف علت کے بعد 'ں' غنہ کا اضافہ گجراتی اردو کی خصوصیت بتاتے ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کہناں (کہنا)، ہلنیں جلنیں (ہلنے جلنے) منیں (منے، میں)، چلنیں (چلنی) خوبیں (خوبی)، بھتیں (بھتے۔ سے)

دکن کی طرف اردو نے دو بار ہجرت کی۔ پہلی مرتبہ تغلقوں کے ہمراہ چند جو بیں

---

[1] ملاحظہ فرمائیے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا مقالہ 'کتب نورس' مطبوعہ 'اردو ادب' بابت اپریل تا جون ۱۹۵۲ء

صدی عیسوی میں جس کا ذکر اوپر تفصیل کے ساتھ کیا گیا۔ دوسری مرتبہ سترھویں صدی میں جب اورنگ زیب جرار لشکر لے کر دکن کی طرف روانہ ہوا اور اورنگ آباد کو اس نے اپنا مستقر بنایا۔ اردو کی اس دوسری ہجرت کی وجہ سے شمال کی اردو کا تقریباً ساڑھے تین سو سال کی طویل جدائی کے بعد دکن کی اردو سے ملاپ ہوا۔ دونوں پیار سے ملیں گلے شکوے ہوئے اور دونوں کے دل کے غبار جو ایک کو دوسرے سے جدا کئے ہوئے تھے، دور ہو گئے۔ — مولوی عبدالحق فرماتے ہیں[۱]:۔

اس دور میں اورنگ آباد کی تقریباً پوری آبادی شمالی ہند کی آبادی تھی۔ اور سارا رنگ ڈھنگ دلی کا سا نظر آتا تھا۔ سراج کے کلام کا مقابلہ آبرو، حاتم، ناجی وغیرہ سے کیجیے۔ معلوم ہوتا ہے ایک ہی مقام کے شاعر ہیں"

اردو کی تاریخ میں اس دور کی بڑی قدر و قیمت ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو کا عمومی معیار اس دور میں قائم ہوا۔ ڈاکٹر چیٹرجی کا خیال ہے کہ لفظ اردو اس دور کی پیداوار ہے اس سے پہلے اردو کو ہندی یا ہندوی کہا جاتا تھا۔ دہلی کی زبان اورنگ زیب اور اس کی سپاہ کے ہمرکاب دکن پہنچی۔ جہاں دکنی مسخ شدہ شکل میں بولی جا رہی تھی شعر و سخن کے چرچے بھی تھے۔ دکنی سے امتیاز کے لیے دکنیوں نے فرودگاہ شاہی کی زبان کو زبان اردوئے معلی کے نام سے یاد کیا اردو اس کا اختصار ہے[۲]۔

ڈاکٹر چیٹرجی کا یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا۔ دہلی کی زبان کا نام اردو قدیم ہے اور جیسا کہ میں نے اس مقالے کے پہلے باب میں عرض کیا اردو کو یہ نام اس وقت ملا جب بارھویں صدی عیسوی میں مسلمان سپاہیوں نے اسے گلے لگایا اور شاہی کیمپ میں پال پوس کر پروان چڑھایا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے دکنیوں نے اردو کو کبھی

---

[۱] مقدمہ گل عجائب صفحہ ۹۱

[۲] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۸۲

اردو کے نام سے نہیں پکارا۔ وہ اسے ہندی یا ہندوی کہتے رہے اور جب اپنی زبان سے تمیز کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے شمال کی اردو کو ہندوستانی یا زبانِ ہندوستان کے نام سے یاد کیا[۱]۔ اردو یا زبانِ اردوئے معلی کا استعمال اگرچہ اورنگ زیب کے عہد سے پہلے نہیں ہوا لیکن اس کے قریب سراج الدین علی خاں آرزو اور ان کے بھانجے میر تقی میر نے اس لفظ کو جس بے تکلفی سے استعمال کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب سے پہلے بھی دہلی کی زبان کو عام طور سے اردوئے معلی کہا جاتا تھا۔ میر کے اقتباسات باب اول میں درج ہو چکے ہیں۔ خان آرزو کے دو اہم اقتباسات درج ذیل ہیں۔

لفظ چھنال کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۲]۔

معلوم نیست لغت کجاست۔ ما مردم کہ اہلِ ہندیم و در اردوئے معلی می باشیم نشنیدہ ایم“

اردوئے معلی سے دہلی کی چھاؤنی مراد ہے اس لئے کہ آرزو دہلی میں رہتے تھے

”آں شعریست بہ زبانِ ہندی اہلِ اردوئے ہند غالباً بطریقِ شعر فارسی و آں الحال بسیار رائج ہندوستان است و سابق در دکن رواج داشت بہ زبانِ ہماں ملک[۳]“

”زبانِ اہلِ اردوئے ہند“ کہہ کر آرزو اس کو صاف کر دیتے ہیں کہ دہلی کے شاہی معسکر کی زبان ہونے کی وجہ سے اردو کو زبانِ اردوئے معلی کہا گیا۔

شمالی ہند میں اردو پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد، بہار، اودھ ہر جگہ گئی۔ لیکن اس کے تعلقات دہلی کی اردو سے قائم رہے اور اگر کبھی منقطع بھی ہوئے تو جلد پھر قائم ہو گئے اس لئے ان مقامات کی اردو دہلی کی اردو سے بچھڑنے نہ پائی۔ چند جزوی اور سرسری اختلافات کے سوا جو بول چال تک محدود تھے اس کا معیاری

---

۱ انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۸۸

۲ نوادر الالفاظ صفحہ ۲۹۴

۳ دادِ سخن بحوالہ مقدمہ نوادر الالفاظ صفحہ ۳۳۔

رہا جو دہلی کی اردو کا تھا۔ دہلی زبان کا مرکز تھا۔ دوسرے مقامات کی اردو بولنے والے اپنی بول چال میں دہلی کی زبان سے انحراف پاتے تو اس کی اصلاح کر لیتے اور اپنی اردو کو دہلی کے روزمرہ اور محاورے کے مطابق ڈھال لیتے۔ اس لئے ان مقامات کی اردو مقامی بولیوں سے بہت کم متاثر ہوئی اور جو تھوڑا بہت غیر شعوری تاثر راہ پا گیا تھا وہ ادبی ترمیم و اصلاح کے بعد دور ہو گیا۔ ہر جگہ دہلی کی زبان رواج پا گئی۔ ادھر دہلی پر مصائب کی گھٹائیں چھائیں تو دہلی والے دہلی سے نکل کھڑے ہوئے اور جسے جہاں گوشۂ عافیت ملا فروکش ہو گیا۔ کوئی مشرق گیا تو کسی نے مغرب کی راہ لی۔ جتنی مرتبہ دہلی کا سہاگ اجڑا اتنی ہی مرتبہ شمالی ہند کے دوسرے مقامات آباد ہوئے۔ اور اس شر سے خیر کی یہ صورت نکلی کہ دہلی کی اردو اپنی اسی نکھری ہوئی شکل میں سارے ملک پر چھا گئی۔ ہر جگہ اس کا ڈنکا بجنے لگا۔ انشاء اللہ خاں انشا لکھتے ہیں:

"ایں مجمع (باشندگانِ دہلی) ہر جا کہ برسد او از آنجا دلی والا گفتہ شوند و محلۂ ایشاں محلۂ اہلِ دہلی۔ و اگر تمام شہر را فرا گیرند آں شہر را اردو نامند"[۱]

دہلی والے جہاں آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے تو وہاں اودھی (پوربی) بولی جا رہی تھی۔ اردو نے اودھی کو نکال باہر کیا اور خود اس کی جگہ رائج کرنے لگی۔ اہلِ دہلی پورے شہر پر قابض ہو گئے۔ اور لکھنؤ لکھنؤ نہیں رہا دلی بن گیا۔

"در لکھنؤ از سبب قرب تمام شاہ جہاں آبادیاں فصیح و غیر فصیح جمع شدہ اند و ایں شہر جہاں آباد شدہ است لکھنؤ نماندہ است"[۲]

لکھنؤ والے ہر لفظ کی تحقیق اہلِ دہلی سے کرتے اور ان سے صحت، لب و لہجہ اور تلفظ میں ان کی ریس فخر سمجھتے۔ انگریز کی سازشوں کے اثر سے لکھنؤ دہلی سے سیاسی

۱؎ دریائے لطافت

۲؎ ایضاً

طور پر آزاد ہوا۔ تو گویا اسے لسانی استقلال کا پروانہ مل گیا۔ لوب و زبان کے نام پر تصرفات ہونے لگے۔ تراش خراش شروع ہوئی قطع و برید کی گئی۔ اس سے زبان کو فائدہ تو کیا ہوتا الٹا نقصان ہوا۔ زبان کی مرکزیت ختم ہو گئی جو زبان کے ارتقاء کے لیے ضروری تھی۔۔۔

۱۸۵۷ء کے بعد سے اردو کا ایک معیار قائم ہو گیا تھا۔ اور یہ معیار دہلی کی زبان تھی جو ملک کے ہر حصے میں شعر و سخن کیلئے "دہلی کی زبان" "زبان متفرقہ" کی حیثیت رکھتی تھی۔ لکھنؤ کے تصرفات نے "زبان متفرقہ" کو صدمہ پہنچایا۔ زبان کا ارتقا فطرت کے مطابق ہوا کرتا ہے غیر فطری پابندیاں لگانے سے اس میں ایک طرح کا تکلف آ جاتا ہے اور اس کا ارتقا رک جاتا ہے۔ اہلِ لکھنؤ کے تصرفات، جیسا کہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔ خامیت کا اثر تھے۔ جدت کے شوق میں لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں نے اردو کو بہت سے ٹھیٹ الفاظ اور بول چال کے محاورے، عامیانہ قرار دے کر ترک کر دئے اور ان کی جگہ عربی کے ثقیل الفاظ اور فارسی کی مشکل ترکیبیں داخل کر دیں[۱]۔ لکھنؤ والوں کی یہ اختراعات ہیں جن پر انہیں فخر ہے لیکن زبان کے فطرت شناس جانتے ہیں کہ ان سے اردو کا قدرتی بہاؤ رک گیا اور اس کا فطری سرجوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

دہلی سے قطع تعلق کے بعد لکھنؤ کی اردو اودھی کے اثر میں آئی۔ ڈاکٹر زور فرماتے ہیں[۲]:

"لکھنؤ مشرقی ہندی کے علاقے میں آباد ہے۔ اور وہاں کی اردو زبان اودھی سے بہت کچھ متاثر ہوئی ہے"۔

ایک زمانہ تھا کہ بقول حکیم احمد علی یکتا[۳]:-

"زبان مردمان لکھنؤ کہ از قدیم الایام باشندۂ آں بلدہ ہستند و بعضے در زمان سال

---

[۱] "آسان اردو" مطبوعہ نقوش، فروری مارچ ۱۹۵۳ء۔

[۲] ہندوستانی لسانیات صفحہ ۱۲۱

[۳] دستور الفصاحت مقدمہ

بفصاحت نزدیک تر ہو چکا ہے

مردمانِ لکھنو کی زبان فصاحت سے نزدیک تر ہونے کی وجہ یہ تھی۔

"شعراءِ شہر پر کلام ودیگر خوش بیاناں کہ مدار محاورہ بریں بزرگان ست ہم بدرگاہ وزیر ممدوح (نواب آصف الدولہ) حاضر بودند و مدتہا بسر بردند[۱]"

جب تک "لکھنؤ والے اپنے کو دہلوی سمجھتے رہے اور وہاں کے قدیم باشندوں کو پوربی[۲]"۔ جب تک انہوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ "ہم پورب میں ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں کے آدمیوں کی زبان کی عادت پڑ جائے[۳]"۔ ان کی زبان دہلی کی زبان کے مطابق رہی لیکن دہلی کے اثرات سے آزادی ملتے ہی ان کی زبان بدلنی شروع ہوئی۔ انشا کے زمانے میں یہ تبدیلی دو چار لفظوں تک محدود تھی۔

"ان کی زبان ایک دو لفظوں میں دہلویوں سے مغائرت رکھتی ہے[۴]"۔ بعد میں بڑھ کر اس نے زبان کے دوسرے اہم عناصر پر بھی سایہ ڈالا۔ اور جی تذکیر و تانیث کے باب میں کسی قدر لاپرواہی واقع ہوئی ہے، اس لاپرواہی کا اثر لکھنؤ کی زبان پر یہ ہوا کہ۔

(۱) بہت سے الفاظ جو دہلی میں مذکر تھے لکھنو والوں نے انہیں مؤنث ٹھہرایا اور جو مونث تھے انھیں مذکر بتایا۔

(۲) مذکر الفاظ کی جن کے آخر میں کوئی حرفِ صحیح ہو۔ فاعلی حالت میں جمع نہیں ہوتی۔ اہل لکھنؤ نے 'یں' بڑھا کر جمع بنائی جیسے برسیں۔ شعریں۔ لفظیں۔ چیتیں۔

(۳) عربی کے مونث الفاظ کی جمع کا مکسر ہو یا سالم، اہل لکھنؤ نے مذکر استعمال کیا اور اسے فصیح سمجھا۔

(۴) 'نا' (علامتِ استقبال) اردو میں مصرف ہے جو قاعدے کے مطابق مذکر میں

---

[۱] دستور الفصاحت مقدمہ

[۲] ترجمہ دریائے لطافت صفحہ ۱۱۴

[۳] ایضاً ۶۴

[۵] ترجمہ دریائے لطافت صفحہ ۶۴

'نا' مذکر سے مونث میں 'نی' ہو جاتی ہے۔ جیسے مجھے روٹی کھانی ہے۔ اسے سبق پڑھنا ہے۔ اہلِ لکھنؤ نے ہر حال میں اسے 'نا' رکھا۔ جیسے بھیجنا ہیں ایک کم سن کے لئے

اس کے علاوہ 'نے' کے استعمال میں انھوں نے بڑی بے قاعدگی کی بعض افعال کی ماضی پر 'نے' آنا چاہیئے۔ جیسے پڑھنا، سوچنا، بولنا (جب اس کے ساتھ مفعول ہو) انھوں نے ان پر 'نے' داخل نہیں کیا۔ وہ خوب پڑھے۔ وہ آننا نہ سوچے۔ وہ جھوٹ بولے۔ اس نوع کے جملے ان کے یہاں عام ہیں۔

لفظ تاکیدِ 'ہی' کو جب انھوں نے ان، تم، ہم پر داخل کیا تو دہلی کی تقلید میں 'ہیں' بنا کر انہی کو انہیں، تمہی کو تمہیں اور ہمی کو ہمیں کہا۔ یہ تصرف انشا کے زمانے میں رائج ہو چکا تھا اور شجاع الدولہ کے عہد میں اسے صحت و فصاحت کی سند مل چکی تھی۔ دریائے لطافت ۱۸۰۸ء میں لکھی گئی۔ اس میں انشا تصریح کرتے ہیں[1]:

"انہیں سے دراصل 'انہی سے' باشد لیکن حالا استعمال نقش نیکوتر از اصل باشد"

ان چند جزوی اثرات کے علاوہ لکھنؤ کی اردو پر دہلی کا اور کوئی نمایاں چھاپا نہیں پڑا اس لیے اہلِ علم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور اسے چنداں اہمیت نہیں دی۔

دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ چند مقامی الفاظ اور محاورات میں معمولی سا فرق تھا جو پہلی بڑی جنگ کے بعد ختم ہو گیا۔ ان قدیم لسانی مراکز کی زبانیں ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئیں اور لسانی وحدت میں ڈھل گئیں۔ بہت سے الفاظ جو صرف دہلی میں مستعمل تھے لکھنؤ میں بھی استعمال ہونے لگے اور اس کے برعکس لکھنؤ کے الفاظ و محاورے دہلی میں رواج پا گئے۔ جھلک میں اہلِ لکھنؤ نے تصرف کر کے جھلکی بنایا۔ آج جھلکی ہر شخص کی زبان پہ ہے 'کھم' اور 'کھمبا' دونوں

[1] دریائے لطافت صفحہ ۱۷۱

پہلو بہ پہلو رائج ہیں۔ ہمیں بول جانا اور ہمیں بھول جانا میں اب کچھ فرق نہیں کیا جاتا۔ شرالبد آج ایسا ہی مستند ہے جیسا شور لبد۔ زبان کی ترقی کے لئے آج اس کی سخت ضرورت ہے کہ اس کا کوئی معیار ہو۔ اور معیار مرکز کی تعیین کے بغیر مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

---

(۱۰)

اُردوے قدیم

پچھلے ابواب میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ آج جس زبان کو ہم اردو کہتے ہیں وہ اسلامی قبائل کے ہمرکاب پاک و ہند آنے والی قدیم پراکرت کے کسی قدیم تر روپ کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ زبان کی علم فطرت کے مطابق یہ زبان کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہی، برابر اٹھتی بدلتی اور زمانے کے ختم نہ ہونے والے بہاؤ کے ساتھ ساتھ آگے کی طرف بہتی رہی۔ اس کا نام اردو اس کو تیرہویں صدی عیسوی میں ملا جب مسلمانوں کی سرپرستی میں اس کا احیا ہوا اور اس نے ایک نئی زندگی پائی۔ لفظ اُردو اس نئی زندگی کی یادگار ہے۔ اردو نے اب تک اپنی اس نئی زندگی کی ساڑھے چھ صدیاں گزاری ہیں جن میں سے پہلی چار صدیاں (۱۳۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک) اس کی زندگی کے قدیم دور کی آئینہ دار ہیں۔ ۱۷۰۰ء کے بعد اس نے نئی زندگی کے نئے دور میں قدم رکھا۔ فارسی زبان کے ذخیرے سے تو وہ پہلے ہی روشناس ہو چکی تھی۔ ۱۷۰۰ء کے بعد فارسی شاعری کے رنگا رنگ امکانات تک اس کی رسائی ہو گئی۔ ان

امکانات کو اپنی فطرت میں سمو کر اس نے اپنے کو اس قابل بنایا کہ آج برصغیر کی ہمسر زبانیں اس سے آنکھ ملاتے شرماتی ہیں۔

چودھویں صدی کے شروع میں دکن و گجرات بھی گئی اور وہاں وطن سے دور خوب خوب پروان چڑھی۔ سہ پردیس کی قدیم زندگی کی جھلک تو دکنی ادب کے آئینہ میں نظر آ جاتی ہے۔ لیکن دہلی کی قدیم زندگی ہنوز تاریکی میں ہے۔ اس پر سے ابھی اچھی طرح پردہ نہیں اٹھا ہے۔

خواجہ مسعود سعد سلمان (متوفی ۱۱۲۹ء) کی بابت محمد عوفی صاحب لباب الالباب اور میر خسرو نے لکھا ہے تین دیوان ان کی یادگار ہیں ان میں سے ایک ہندوی زبان میں ہے۔ اس پر حکیم شمس اللہ قادری اور مولانا شیرانی فرماتے ہیں خواجہ ہندی میں شعر کہا کرتے تھے میں اپنے مقالے کے پہلے باب میں عرض کر چکا ہوں کہ مسلمان اہلِ علم نے ہر چند اردو کو ہندی یا ہندوی کے نام سے یاد کیا لیکن وہ ہندوستان کی دوسری قدیم و جدید بولیوں کو بھی ہندی کہا کئے۔ مسلمانوں کے لئے ہندی ایک علم لفظ تھا جسے وہ اردو، پنجابی بہاری، برج، اودھی، کے علاوہ پراکرت اور اپ بھرنش کے لئے یکساں طور سے استعمال کرتے اور جب تخصیص کی ضرورت پیش آتی تو وہ ان زبانوں میں سے کسی ایک زبان کی طرف اضافت کر کے کہتے 'ہندی' برج 'ہندی' اودھ۔ چنانچہ خان آرزو نے جب فصحائے دہلی کی اردو مراد لی تو انہیں زبانِ ہندی اہلِ اردو جیسی عجیب و غریب ترکیب وضع کرنی پڑی۔

مسعود سعد سلمان کا کلام دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گیا۔ اگر دستیاب ہو بھی جاتا تو چنداں سود مند نہ تھا۔ اس لئے کہ وہ رائج الوقت پنجاب کی اپ بھرنش زبان میں تھا یا سنسکرت میں۔ اس زمانے میں سنسکرت فارسی کی طرح ادبی اور شعر کی زبان تھی۔ محمود غزنوی کے عہد میں چند سکے ہم دریافت ہوئے ہیں۔ ان پر سنسکرت زبان میں

یہ الفاظ منقوش ہیں۔

"ادبکتیم ایکم، محمد اوتار، نرپتی محمود' ایم ٹنکو محمود لپورے گھٹے جتو۔

ترجمہ جسے خدا ایک ہے۔ محمد اس کے رسول ہیں۔ محمود امیر المومنین ہے۔ یہ ٹکا محمود پور کے دار الضرب میں ڈھالا گیا۔"

اردو کا ارتقا دکھانے کے شوق میں ہمارے اکثر اہلِ علم اردو کی شخصیت کو ملحوظ نہیں رکھتے اور اردو کی معاصر زبانوں کے نمونے اردو کے نام سے پیش کر دیتے ہیں۔ دسویں صدی عیسوی کے قریب برصغیر میں اپ بھرنش کا راج تھا جو جدید آریائی بولیوں کی جگہ ملک میں بولی جا رہی تھی۔ اس سے ترقی پا کر آج کی آریائی بولیاں وجود میں آئیں جن میں سے ہر ایک دسویں صدی کی خاص اپ بھرنش کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اردو بھی کسی ایک اپ بھرنش کی کوکھ سے پیدا ہوئی۔ میں اپنے مقالے میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ یہ اپ بھرنش دہلی اور میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جا رہی تھی۔ دسویں صدی کے قریب صرف یہی ایک اپ بھرنش تھی جس سے اردو نے ارتقا پایا۔ اس کے ساتھ آس پاس اور بھی کئی اپ بھرنشیں تھیں جو ہر چند اردو کو جنم دینے والی اپ بھرنش کی عزیزہ ہیں اور اس سے قریب کی قرابت رکھتی ہیں لیکن اردو کے سلسلۂ نسب میں نہیں آتیں۔ اردو نے ان سے ارتقا نہیں پایا۔ اس لئے اردو کے عہد بہ عہد ارتقا کے سلسلے میں ان کا ذکر کرنا اور ان کے ادبی نمونوں کو قدیم اردو کے نمونے بنا کر پیش کرنا مناسب نہیں۔

برج، اودھی، راجستھانی اردو سے مختلف ہیں۔ یہ مانا کہ یہ زبانیں اردو سے بہت ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اردو سے فیض بھی اٹھایا ہے۔ لیکن جہاں اردو کا ارتقا دکھانا مقصود ہو وہاں ان زبانوں کے ادبی نمونے پیش کرنا ایسا ہے جیسے احمد کی ٹوپی محمود کے سر۔ مولانا شیرانی کی علمی قابلیت اور لسانی تبحر مسلّم، لیکن یہ ایک

(۱) جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۶ء ضمیمہ (۴۳۶)

حقیقت ہے کہ مولانا نے اپنی قابلِ قدر کتاب میں اردو کا ارتقاء دکھاتے ہوئے قطبن اور شیخ عثمان وغیرہ شعرا کا کلام پیش کر دیا۔ مولانا اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ لودھی کے شاعر ہیں اور ان کا کلام اودھی میں ہے اور اودھی جیسا کہ میں نے عرض کیا اردو سے مختلف زبان ہے۔ راسو کی بابت میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ وہ ملی جلی زبان میں ہے جس میں راجستھانی برج اور پنجابی عناصر قدیم ہندی (ہندوستانی) کے ساتھ گھل مل گئے ہیں۔

بابا فرید گنج شکرؒ (متوفی ۱۲۶۹ء) کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور ان کا ریختہ مولانا شیرانی کے حوالے سے درج کیا جا چکا ہے لیکن مجھے شبہ ہے کہ وہ ریختہ بابا فرید گنج شکر کا ہے پروفیسر بلدیو سنگھ نے حضرت بابا فرید کے ۱۳۰ شلوک اور ۴ شبد اورینٹل کالج میگزین میں شائع کئے تھے۔ اور انہیں تیرہویں صدی عیسوی کی اردو زبان کا نمونہ بتایا تھا ڈاکٹر چیٹرجی ان شلوکوں کو گرونانک کے معاصر بابا فرید (سولھویں صدی) کی تصنیف بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ غلطی سے بابا فرید گنج شکرؒ کی طرف منسوب کر دئے گئے ہیں۔[1]

امیر خسروؒ (متوفی ۱۳۲۵ء) سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے کھڑی بولی میں شعر کہے لیکن ان کا کلام، جو ان کے نام سے تذکروں میں نقل ہوتا آیا ہے، ایک تو بڑی حد تک مشکوک ہے، بالیقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انہی کا ہے، دوسرے وہ برج آمیز اردو میں ہے یہ اور بات ہے کہ اردو عناصر کی اس میں بہتات ہے۔ برج کے چند الفاظ و افعال اس میں شامل ہوئے ہیں۔ ان کی مشہور غزل ہے:

ز حالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

---

[1] انڈو آرین اینڈ ہندی ۱۲۹

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسروؔ
سپیت من کو درائے راکھوں جو جاں پاؤں پیا کی گھتیاں

یہ صاف اور نکھری ہوئی کھڑی بولی میں ہے لیکن آٹے میں نمک کی طرح اس میں بھی برج کی آمیزش ہو گئی ہے۔ چھتیاں، رتیاں، بتیاں، پتیاں وغیرہ الفاظ اور 'درائے' اور 'راکھوں' وغیرہ افعال برج کے ہیں۔ ذیل کی پہیلیاں بھی ملی جلی زبان میں ہیں۔

اجل برن ادھین تن اک چت دو دھیان
دیکھت میں تو سادھو ہے نپٹ پاپ کا کھان

اک نار ترور سے اتری ماں سے جنم نہ پایو!
باپ کا ناؤں جو واسو پوچھیو آدھو ناؤں بتایو
آدھو ناؤں بتایو خسروؔ کون دیس کی بولی
واکو ناؤں جو پوچھیو میں نے اپنے ناؤں نہ بولی

ایک گنی نے یہ گن کینا ہریل پنجرے میں دے دینا
دیکھو جادو گر کا حال ڈارے ہرا نکالے لال

یہ پہیلیاں ٹھیٹ اردو میں ہیں۔

ایک تھال موتی سے بھرا سب کے سر پہ اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھالی پھرے موتی اس سے ایک نہ گرے

آوے تو اندھیری لاوے جاوے تو سب سکھ لیجاوے

کیا جانوں وہ کیسا ہے جیسا دیکھا ویسا ہے

اک کہانی میں کہوں تو سن لے میرے پوت

بنا پروں وہ اڑ گیا باندھ گلے میں سوت

ہری اودھ خسرو کا خالص اُردو کلام اور پہیلیاں درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں

"خسرو کا قیام (بود و باش) دلی میں تھا۔ میرا وچار ہے کہ اس کے انتوا (اور) میرٹھ کے آس پاس جو بولی اس سمے (وقت) بولی جاتی تھی اس پر درشٹی (نظر) رکھ کر انہوں نے اپنی رچنائیں کیں (شعر کہے) اس لیے وہ ادھک تر (زیادہ تر) بول چال کی بھاشا (زبان) کے انوکول (مطابق) ہیں۔ اور اسی بیان میں وشیش (خاص) صفائی آگئی ہے"!

خسرو کے بعد کبیر (پندرھویں صدی عیسوی) کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ کبیر بنارس کے رہنے والے تھے اس لیے ان کی زبان جیسا کہ خود ان کا بیان ہے:۔

بولی میری پورب کی تا ہے چینے نہ کوئی

مشرق کی معیاری اور مستند ادوھی ہے۔ لیکن ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ کھڑی میں بھی۔ ہے جسے مولانا شیرانی نے نقل کر دیا ہے۔ کبیر نے 'بارہ ماسہ' بھی لکھا تھا جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔

سبھی بیس میں کھیل گنوائی   پیہ کی نیہا نیک نہیں پائی

سات برکھ میں جات نہ جانی   گرد کی بچن نیک نہیں مانی

چھن چھن دیہہ بھی ات جھیتل   پیہ کو سمرن کچھو نہ کینال

سب جوبن اکارت کھویو   بہی نام کبیرا رویو

اس میں پوربی کی آمیزش ہے

؎ ہندی بھاشا اور اس کے ساہتیہ کا وکاس صفحہ ۴۴

یہ غزل ملاحظہ ہو۔

کاسی گیا اور دوارکا تیرتھ شکل بھرمت پھرا
گانٹھی نہ کھولی کپٹ کی تیرتھ گیا تو کیا ہوا

پوستی کتابیں بانچتا اوروں کو نت سمجھاوتا
ترکوٹی محل کھوجے نہیں بک بک مرا تو کیا ہوا

قاضی کتابیں کھوجتا کرتا نصیحت اور کو
محرم نہیں اس حال سے قاضی ہوا تو کیا ہوا

شطرنج چوپڑ گنجفہ اک نرد ہے بد رنگ کی
بازی نہ لائی پریم کی کھیلا جوا تو کیا ہوا

جوگی دگمبر سے بڑا کپڑے رنگے رنگ لال سے
واقف نہیں اس رنگ سے کپڑا رنگا تو کیا ہوا

"کبیر بیجک" اور "کبیر گرنتھاولی" کے نام سے کبیر کے کلام کے جو مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ سکھوں کے گرنتھ صاحب میں بھی ان کا کلام درج ہے، وہ زیادہ قابل اعتبار ہے۔ اس کا صرف ایک بند ملاحظہ ہو۔

جب لگ میری میری کرے — تب لگ کاج ایک نہیں سرے
جب میری مٹ جائے — تب پربھو کاج سنوار ہی آئے
جب لگ سندھ ہوئن ماہی — تب لگ بن بھوے ناہی
جب ہی سیار و سنگھ کو کھائی — پھولی رہی سگلی ترائی
جیتو بوڑے ہارو ترے — گرو پرسادی پار اترے
داس کبیر کہی سمجھائی! — کیول رام رہو جو لائی

شیخ جمالی (متوفی ۹۴۲ھ) بابر کے معاصر ہیں۔ مولانا شیرانی نے ذیل کی غزل

ان کے نام سے درج کر کے لکھا ہے کہ بعض تذکروں میں امیر خسرو کی طرف منسوب ہے۔

...ہر دو تیرا کتّا ہے — موتیا شد بدرد تو ستّا ہے
خمار شدم نثار شدم لٹ گیا — در رہِ عشق تو مرتّا ہے
گرچہ بدم گفت رقیب کتی — اس کا کہا مت کرو یہ جھلّا ہے
گاہ نہ گفتہ کہ جمالی تو بیٹھ — ختم کرد کیا اپنا کرم بچا ہے

اس پر پنجابی اثر نمایاں ہے۔

عہدِ اکبری کے دو شاعروں کا ذکر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے ایک نوریؔ ہیں جو اعظم پور کے رہنے والے تھے۔ ملا فیضی سے بہت اتحاد تھا۔ میر حسن نے ان کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد — بے چارہ نوریؔ نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

دوسرے سعدیؔ، قائم چاندپوری نے انہیں شیخ سعدی شیرازی سمجھا۔ میر تقی میر نے دکن کا باشندہ بتایا۔ وہ کاکوری کے رہنے والے تھے۔ ۱۰۰۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ بختاور علی نے لکھا ہے۔[1]

"طبع موزوں داشت و بزبان فارسی و ہندی شعر نیکو گفتے"

ذیل کی غزل ان کی طرف منسوب ہے۔

تشفر چو دیدم بر رخش گفتم کہ یہ کیا دیت ہے
گفتا کہ در شے بادرسے اس ملک کی یہ ریت ہے
اے مرداں شہر شما کتنی بری یہ ریت ہے
سب سے نمی پرسد کسے پھولیا ماریت ہے

---

[1] بحوالہ اردوئے قدیم طبع اول صفحہ ۱۱۴

ہنا الٹن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا

ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے

دو نین کی کھپر کیوں رو رو بجن دل کروں

پیش سگ کو بیت دھروں پیاسا دہ جائے ہے

سعدی طرح انگیختہ شیر و شکر آمیختہ

در ریختہ در ریختہ ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے

آخر میں مولانا محمد افضل کا ذکر مناسب ہوگا۔ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر میں بود و باش تھی۔ ۱۰۳۵ھ میں انتقال کیا۔ بارہ ماسہ یا بکٹ کہانی ان کی مشہور نظم ہے جس کا ایک بڑا حصہ مولانا شیرانی نے نقل کر دیا ہے۔ ان کی زبان کے بارے میں زور صاحب فرماتے ہیں کہ دکنی ہندوستانی سے خاص طور سے مختلف ہے[۱]۔ صرف چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی	بھئی ہوں عشق کے غم سوں دوانی
نہ مجھ کو سو کھ دن نا نیند راتا	برہ کی آگ میں سینہ جراتا
تمامی لوگ مجھ بوری کہیں ری	خود گم کرہ دمجنوں کہیں ہی
نہیں اس درد کا دارو کسی کن	پھپئے حیراں سبھی حکمہ دی فن
اری جس شخص کوں یہ دیو لاگا	سیانا دیکھ اس کوں دور بھاگا
اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے	کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے

قلیم نثر کے نمونوں میں سے ہری اور صنف پربھتی راج کا مندرجہ ذیل پروانہ جو بارہویں صدی عیسوی کا ہے اور جو اس نے کسی حیلے کے سلسلے میں لکھا تھا۔ نقل کیا ہے:۔

---

[۱] رسالہ ہندوستانی ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۱۸

"شری شری دلین مہاراجم دھیراجم، ہند استھانم راج دھانم، سبھی دیس پورب دلی تشت (تخت) شری شری مہامم، راجم دھیراجم پرتھوی راجی اس ساتھنم اچارج رشی کیش دھنتری اپتن ہم نے کاکاج تم کو دواکی آرام جیتو۔ جن کے ریجم میں دو کر روپیہ ۵۰۰۰ تم سے آئی گوڑے کا شرچا (خرچہ) ہیرا آویں گے کبھی ہم سے ان کو کوئی ماف (معاف) کریں گے۔ جن کو نیر کو کے ادھکاری ہو دیں گے۔ بسی دوبے حکم کے ھنومنت را آئی"

اس میں تم نے، دواکی، آئی (ہاتھی) گھوڑے کا خرچہ، آویں گے، کریں گے ہودیں گے وغیرہ الفاظ وافعال کھڑی بولی کے ہیں۔ لیکن یہ پروانہ جیسا کہ ہری اودھ نے لکھا ہے، راجستھانی میں ہے۔ اسے اردوے قدیم کی مثال کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

چودھویں صدی میں گورکھ ناتھ نے نثر میں بہت کچھ لکھا۔ ذیل کا اقتباس اردو سے بہت مشابہ ہے لیکن وہ برج آمیز راجستھانی میں ہے۔

" سو وہ پرش سمپورن تیرتھ اسنان کر چکو (کر چکا) ارو (اور) سمپورن پرتھوی برہمنی کو دے چکو (دے چکا) ارو ھزر جگ کر چکو، ارو دیوتا سرو (سب) پوج چکو ارو پترنی کو سن تشت کر چکو، سورگ لوک پراپت کر چکو، جا منشیہ کے من چھن ماتر برہم کو کے بچار بیٹھو۔"

گوسوامی وٹھل ناتھ اور ان کے صاحبزادے گوکل ناتھ کا زمانہ سولھویں صدی عیسوی ہے ان دونوں بزرگوں نے برج بھاشا میں کئی کتابیں لکھیں جن میں کھڑی بولی کی آمیزش ہے مثلاً ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"سو ایک دن نند داس جی کے من میں ایسی آئی جو جیسے تلسی داس جی نے رامائن بھاشا کری ہے۔ سو ہم ہوں شریمد بھاگوت بھاشا کریں، یہ بات برہمن لوگن نے سنی تب سب برہمن مل کے شری گوسائیں جی کے پاس گئے سو برہمن

نے بنتی کری جو شری مدبھاگوت بھاشا ہوئے گی تو ہماری اجیوکا (رزق)

جاتے رہے گی۔"

اسی زمانے کے لگ بھگ گنگ کوی (بھاٹ) نے "چند چند ورنن کی مہما"

نام سے ایک کتاب تصنیف کی اس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ یہ اگرچہ خالص اردو

میں نہیں لیکن نسبتاً اردو سے زیادہ قریب ہے:۔

" سری شری پات ساہی جی (بادشاہ جی) دلپت جی (دل کے حاکم) اکبر

ساہ جی آم کھاس (دربار عام خاص) میں تشت (تخت) اوپر براجمان

ہو رہے۔ اور آم کھاس بھرنے لگا ہے جس میں تمام اُمراء آئے آئے

کورنش بجائے۔ جہار کر کے اپنی اپنی بیٹھک پر بیٹھ جائے کریں[1]۔"

---

[1] یہ اقتباسات میں نے ہری اودھ کی کتاب سے لئے ہیں۔

فہرست مآخذ و مصادر

(۱) آرزو (سراج الدین علی خاں) ۔ نوادر الالفاظ مع غرائب اللغات

(۲) انشاء (انشاء اللہ خاں) دریائے لطافت ۔ اصل و ترجمہ اردو پنڈت کیفی

(۳) برنی کوف (اے) ۔ ادبی ہندی" مطبوعہ بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۸ ۔

(۴) بنی کانت کاکتی ۔ آسامی تعمیر و ارتقا ۱۹۴۱ء

(۵) بنارسی داس جین ۔ پنجابی صوتیات ۔

(۶) بابو رام سکسینہ ۔ اودھی کا ارتقا"

(۷) بھنڈارکر (آر ۔ جی) ولسن لسانیاتی لیکچرز ۱۹۱۴ء

(۸) بومفورڈ (ٹی ۔ ایل) "مغربی پنجابی سے متعلق کچھ نوٹ" مطبوعہ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۹۵ء

(۹) بیمز (جان) ہند آریائی زبانوں کی تقابلی گرامر سہ جلد ۔

—— چند برائی کی گرامر کا مطالعہ مطبوعہ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۷۳ء

(۱۰) بیلی (ٹی۔ گراہم) "اُردو ۔ زبان اور اس کا نام" مطبوعہ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء

—— "قدیم اُردو بات چیت" مطبوعہ بلٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز جلد ۶

—— "کیا کھڑی بولی کے معنی گنوارو بولی ہیں؟" مطبوعہ بلٹن جلد ۸

(۱۱) ٹکر (ٹی۔ جی) مقدمہ زبان کی فطری تاریخ

(۱۲) ٹیسی ٹری (ایل۔ پی) "گجراتی مارواڑی میں مفعولی اور اضافی لاحقوں کی اصل" مطبوعہ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۱۳ء

(۱۳) ٹرنر (آر۔ ایل) نیپالی ڈکشنری

(۱۴) ٹمپل (آر۔ سی) "پنجاب کے چند نہرو لوک گیت" مطبوعہ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۸۲ء

(۱۵) جولس بلاک۔ "ہند آریائی لسانیات کے چند مسائل" مطبوعہ بلٹن اسکول اورینٹل اسٹڈیز جلد ۵

(۱۶) چٹرجی (ایس۔ کے) "بنگالی کا آغاز و ارتقا"

—— "انڈو آرین اور ہندی"

—— "خطبہ صدارت اورینٹل کانفرنس" ۱۹۳۵ء

(۱۷) سدھیشور ورما۔ "آریائی زبانیں"

—— "لہندا صوتیات" مطبوعہ جرنل بنگال سوسائٹی ۱۹۳۶ء

(۱۸) سلیمان ندوی۔ نقوش سلیمانی

(۱۹) شیرانی (حافظ محمود خاں) پنجاب میں اردو

(۲۰) شمس اللہ قادری (حکیم) اُردوئے قدیم

۲۱ عبدالحق (ڈاکٹر مولوی) قواعد اُردو

———— اُردو کے نشو و نما میں صوفیہ کرام کا حصہ۔

———— 'آسان اُردو' مطبوعہ رسالہ نقوش ۱۹۵۳ء

———— 'سب رس' ۔ مقدمہ

———— گل عجائب ۔ مقدمہ

(۲۲) عبدالستار صدیقی (ڈاکٹر) کلیات ولی ۔ مقدمہ

۲۳ کیفی (پنڈت دتاتریہ) کیفیہ

(۲۴) کیلاگ ہندی گرامر

(۲۵) گریرسن (جی اے) ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ جلد نہم حصہ اوّل

———— "ڈھکی پراکرت" مطبوعہ جرنل رائل سوسائٹی ۱۹۱۳ء

———— کشمیری زبان کے لہجے
———— جدید ہند آریائی زبانوں کی بنیادی اور صلیاتی گردانیں
مطبوعہ جرنل بنگال سوسائٹی ۱۸۹۵ء

———— "ہند آریائی زبانیں" مطبوعہ بلٹن اسکول اورینٹل اسٹڈیز جلد اوّل

(۲۶) قائم چاندپوری ۔ "مخزن نکات"

(۲۷) محی الدین قادری زور (ڈاکٹر) اردو شہ پارے

———— ہندوستانی لسانیات

———— ہندوستانی صوتیات

———— "دہلی میں اردو شاعری کا آغاز" مطبوعہ رسالہ ہندوستانی ۱۹۳۶ء

(۲۸) میرزا خاں تحفۃ الہند

(۲۹) میر تقی میر نکات الشعراء

———— ذکر میر

(۳۰) نجیب اشرف ندوی۔ تبصرہ پنجاب میں اردو۔ مطبوعہ رسالہ معارف اگست ۱۹۲۸ء

(۳۱) نورالحسن ہاشمی (ڈاکٹر) اردو شاعری کا دبستان دہلی۔

"دہلی اور لکھنؤ کی زبان" مطبوعہ رسالہ شاعر سالنامہ

(۳۲) ہری اودھ (ایودھیا سنگھ اپادھیائے) "ہندی بھاشا اور اس کے ساہتیہ کا وکاس"

(۳۳) ہیرنلے لائے۔ ایف، آر) گوڑین زبانوں کی گرامر

۔گوڑین زبانوں کی تقابلی گرامر

کی تائید میں مقالات مطبوعہ

جرنل بنگال سوسائٹی ۴۳، ۴۴، ۱۸۷۲ء

(۳۴) ییسپرسن (او) زبان میں ارتقا

۔انگریزی زبان کی ساخت، فطرت اور

نشوونما۔

اس کے علاوہ بعض اور مآخذ بھی ہیں جن سے جزوی مدد لی گئی ہے۔ ان کا ذکر موجبِ تطویل تھا اس لئے چھوڑ دیا گیا۔